اپنے موضوع پر ایک مُفید کتاب
قیاس اور تقلید کی حقیقت
اور
شرعی حیثیت
www.e-iqra
مُرتبہ
مولانا کمال الدین المسترشد مدظلہ
جامعہ اسلامیہ کلفٹن، کراچی
ناشر
ادارۂ دعوت اسلام
جامعہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد کراچی

نام کتاب	قیاس اور تقلید کی حقیقت اور شرعی حیثیت
مرتبہ	حضرت مولانا کمال الدین صاحب مدظلہٗ
طباعت	اول
طابع	حسن الرحمٰن عبداللہ
کمپوزنگ	صدیقی کمپوزرز۔ ماڈل کالونی، کراچی
	فون: 0320-4084547, 4504007
ناشر	ادارہ دعوتِ اسلام
	جامعہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد سوسائٹی،
	کراچی ۷۴۸۰۰

ملنے کے پتے

- اسلامی کتب خانہ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
- مکتبہ رشیدیہ بالمقابل مقدس مسجد اردو بازار کراچی
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ماہنامہ ''بینات'' ذوالحجہ ۱۴۲۳ھ کے بصائر و عبر میں ''دورِ حاضر کے فتنوں کا تعاقب اور علمائے دیوبند کی مساعی'' کے عنوان سے راقم الحروف نے دورِ حاضر کے خدوخال کی نشاندہی کے لئے چند احادیث و روایات نقل کی تھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے ان میں سے چند ایک یہاں بھی نقل کروں:

الف:...... ''عن العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یظھر ھذا الدین حتی یجاوز البحار وحتی یخاض الخیل فی سبیل اللہ، ثم یأتی اقوام یقراؤن القرآن فاذا قرأوہ قالوا: "قد قرأنا القرآن فمن اقرأ منّا؟ من اعلم منّا؟" ثم التفت الی اصحابہ فقال: ھل ترون فی اولئک من خیر؟ قالوا: لا! قال: اولئک منکم و اولئک من ھذہ الامۃ اولئک وقود النار.''

(کتاب الرقائق ابن مبارکؒ ص:۱۵۲)

ترجمہ:...... ''حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ دین یہاں تک پھیلے گا کہ سمندر پار تک پہنچ جائے گا، اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بحر و بَر میں گھوڑے دوڑائے جائیں گے، اس کے بعد ایسے گروہ آئیں

گے جو قرآن مجید پڑھ لینے کے بعد کہیں گے: ”ہم نے قرآن تو پڑھ لیا، اب ہم سے بڑا قاری کون ہے؟ ہم سے بڑھ کر عالم کون ہے؟“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے کہ ان میں ذرہ بھی خیر ہوگی؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: نہیں! پھر فرمایا: مگر ایسے لوگ بھی تم مسلمانوں ہی میں شمار ہوں گے، ایسے لوگ بھی اس امت میں ہوں گے، یہ لوگ (دوزخ کی) آگ کا ایندھن ہوں گے۔“

ب:......”عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: يكون فی آخر الزمان دجالون كذابون يأتونكم من الاحاديث ما لم تسمعوا انتم ولا آبائكم، فاياكم واياهم! لا يضلونكم ولا يفتنونكم.“

(صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۰)

ترجمہ:......”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: آخری زمانہ میں بہت جھوٹے مکار لوگ ہوں گے، جو تمہارے سامنے (اسلام کے نام سے نئے نئے نظریات اور) نئی نئی باتیں کریں گے جو نہ کبھی تم نے سنی ہوں گی اور نہ تمہارے باپ دادا نے، ان سے بچنا! کہیں وہ تمہیں گمراہ نہ کردیں اور فتنہ میں نہ ڈال دیں!“

ج:......”عن ابن مسعود رضی الله عنه قال: عليكم بالعلم قبل ان يقبض! وقبضه ان يذهب باصحابه، عليكم بالعلم! فان احدكم لا يدری متی يفتقر الی ما عندهٗ، انكم ستجدون اقواماً يزعمون انهم يدعونكم الی كتابِ الله وقد نبذوه وراء ظهورهم، فعليكم بالعلم! واياكم التبدع! واياكم والتعمق! عليكم بالعتيق.“ (سنن دارمی ج:۱ ص:۵۰)

ترجمہ:...... ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: علم اُٹھ جانے سے پہلے علم حاصل کرلو! علم کا اُٹھ جانا یہ ہے کہ اہل علم رخصت ہوجائیں، خوب مضبوطی سے علم حاصل کرو، تمہیں کیا خبر کہ کب اس کی ضرورت پیش آئے، اور علم سے فائدہ اُٹھانا پڑے، عنقریب تم ایسے لوگوں کو پاؤ گے جن کا دعویٰ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں قرآنی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ کتاب اللہ کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا ہوگا، اس لئے علم پر مضبوطی سے قائم رہو، نئی اُپج، بے سود موشگافی اور لایعنی غور و خوض سے بچو (سلف صالحین کے) پرانے راستہ پر قائم رہو۔''

بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آج سے چودہ سو سال پیشتر جن خطرات کی نشاندہی فرمائی تھی، آج وہ ایک ایک کرکے ہماری آنکھوں کے سامنے آرہے ہیں، اور دین کے نام پر بے دینی، قرآن وسنت کے نام پر دین سے انحراف، اور ''سلفیت'' کے نام پر اسلاف سے بغاوت کا درس دیا جارہا ہے۔ اسلافِ امت اور خیرالقرون کے اکابر کی تجہیل وتحمیق کو تحقیق وتدقیق کا خوشنما عنوان دیا جارہا ہے۔ یوں آفتابِ نبوت سے دور اور سیدھے سادے مسلمانوں کو خودرائی وخودرَوی کے زہر آلود انجکشن لگالگا کر ان کے ایمان وعقیدہ کو موت کے گھاٹ اُتارا جارہا ہے۔

اکابر فرماتے ہیں - اور تجربہ بھی یہی ہے- کہ اسلام دشمن قوتوں کا سب سے پہلا اور کاری وار یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف، اکابر اور اہل تحقیق سے بدظن کردیا جائے، نعوذ باللہ! ان اکابر کو مسلمانوں کے نزدیک جھوٹا، مکار اور جاہل باور کرایا جائے، اور یہ کہا جائے کہ دین سمجھنے کے لئے تمہیں کسی کی تقلید کے بجائے براہِ راست قرآن وسنت سے اخذ واستفادہ کرنا چاہئے۔

بظاہر یہ بہت ہی خوش کن عنوان ہے کیونکہ اس میں براہِ راست کتاب وسنت سے استفادہ کی تلقین ہے، مگر بغور دیکھا جائے تو اس میں یہ دجل وتلبیس مضمر و پوشیدہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اکابر واسلاف اور ائمہ تحقیق واجتہاد سے بدظن ہوجائے گا تو اسے اپنے

دامِ تزویر میں پھانسنا آسان ہوجائے گا، اس لئے کہ وہ بدقسمت خود تو اتنی استعداد نہیں رکھتا کہ براہِ راست قرآن و حدیث سے اخذ و استفادہ کر سکے، کیونکہ اگر اس میں کوئی استعداد و صلاحیت اور حق و باطل میں امتیاز کا ملکہ ہوتا تو ہوس پرستوں کے اغوا کا شکار ہی کیوں ہوتا؟ لہٰذا مجبوراً وہ انہی اغوا پرستوں کی طرف رجوع کرے گا، یوں وہ اپنی مرضی سے اس کو گمراہ کریں گے، جس کو دین بتلائیں گے اسے وہ دین سمجھے گا، اور جس کو بے دینی کہیں گے، اسے وہ بے دینی باور کرے گا۔ یہ معلوم کرنے اور پرکھنے کے لئے کہ اس کو جو کچھ بتلایا گیا ہے، حقیقت سے کتنا میل کھاتا ہے؟ اس میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہے؟ اس کے پاس کوئی معیار نہیں ہوگا، کیونکہ اسے پہلے ہی ایسے تمام حضرات سے بدظن کیا جاچکا ہے، جو حقیقتِ حال کی نقاب کشائی کی استعداد و صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں وہ کولہو کے بیل کی طرح اپنے اس ''محسن'' کی جاہلانہ تحقیقات کے گرد چکر لگاتا رہے گا، اور اکابر علمائے امت، اربابِ علم و تحقیق، ائمہ اجتہاد اور خیر القرون کے اربابِ فضل و تقویٰ کی مبارک و مامور تقلید کی بجائے ان نام نہاد محققین کی ''شاہکار تحقیقات'' کے لق و دق صحرا میں ایڑیاں رگڑتے رگڑتے دفن ہوجائے گا، اعاذنا اللّٰہ من سوء الفہم!

یہ ہے وہ فتنہ جس کی نشاندہی آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمائی، اور جس سے بچنے کی تلقین فرمائی۔

کس قدر بدنصیبی اور کس قدر دنائت و سفاہت ہے کہ امت کو ائمہ اجتہاد: امام الائمہ امام ابوحنیفہ، امام دارالہجرۃ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل قدس اللہ اسرارہم کی تقلید سے تو روکا جائے، نعوذ باللہ! اسے شرک قرار دیا جائے، اور اسے مشرکینِ مکہ کے قول: **"ما وجدنا علیہ آبائنا!"** کے ہم سنگ قرار دیا جائے، لیکن اس کے بالمقابل پندرہویں صدی کے نام نہاد محققین- جن کی الا ماشاء اللہ، خیر سے شکل و شباہت اور قول و فعل بھی اسوۂ حسنہ سے میل نہیں کھاتا- کی اندھی تقلید کا پٹہ ان کے گلے میں ڈالا جائے اور اسے ''سلفیت'' کا نام دیا جائے۔ حیف ہے اس عقل و دانش پر! اور تُف ہے اس سفاہت و دنائت پر! اسی طرح شاباش ہے ان ''عقل مندوں'' کی ''عقل'' کو! جو دو اور دو چار کے اس

عام فہم کلیہ کو سمجھنے کی استعداد و صلاحیت تو نہیں رکھتے مگر چشم بددور! زبانِ طعن کھولتے ہیں اربابِ اجتہاد و حضراتِ ائمہ اربعہ اور ان کے اصحابِ علم و فضل مقلدین پر۔

کیا کوئی ان نام نہاد اہل حدیثوں اور سلفیوں سے پوچھ سکتا ہے کہ ان کے عوام و خواص چشم بددور! حضراتِ صحابہ کرامؓ سے زیادہ علم و فضل رکھتے ہیں کہ ان کے لئے تقلید حرام ہوگئی ہے؟ کیا خیر سے تمام ''اہل حدیث'' درجۂ اجتہاد پر فائز ہیں؟ کیا وہ سارے کے سارے ہر ہر مسئلہ کے دلائل و براہین، ناسخ و منسوخ، مقدم و مؤخر کو جانتے ہیں؟ کیا وہ اس معاملہ میں اپنے تمام مسائل خود مستنبط کرتے ہیں اور ان کے ہاں کوئی کسی سے مسئلہ معلوم نہیں کیا کرتا؟ کیا ان کے ہر ہر فرد کو معلوم ہے کہ کون سی حدیث خبرِ متواتر ہے؟ کون سی مشہور؟ کون سی خبرِ واحد؟ کون سی صحیح؟ کون سی ضعیف و سقیم ہے؟ اور کس آیت و حدیث سے کون سا حکم ماخوذ ہے؟

اسی طرح کیا ان سے یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ شرائطِ حدیث، ان کی صحت و سقم کے اسباب و وجوہ کے بارہ میں ان کے علم کے ذرائع کیا ہیں؟ کیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے؟ کیا قرآن و سنت میں ان معیارات کے بارہ میں کوئی تصریح موجود ہے؟ اگر نہیں تو کیا مذکورہ اصطلاحات اور راویانِ حدیث کے بارہ میں قائم کردہ معیارات کے بارہ میں انہوں نے اربابِ فن کی تقلید نہیں کی؟ کیا انہوں نے لغتِ عربی میں اربابِ لغت کی تقلید نہیں کی؟ کیا انہوں نے اپنے اساتذہ کی معلومات کو سچا جان کر ان کی تقلید نہیں کی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو بتلایا جائے کہ تقلید اور کس چیز کا نام ہے...؟

ہمارے خیال میں ان دانشوروں کو اگرچہ اپنی ''دانست'' پر ناز ہے، مگر افسوس کہ ان کو تقلید کا معنی سمجھنے میں دھوکا لگا ہے، کیونکہ تقلید کا معنی ہے:

''کسی کا قول محض اس حسنِ ظن پر مان لینا کہ یہ دلیل کے موافق بتلائے گا، اور اس دلیل کی تحقیق نہ کرنا۔'' (الاقتصاد ص:۵)

ہمارے خیال میں، بلکہ مذکورہ بالا گزارشات کی روشنی میں وہ بیچارے اس کے تو قائل ہی ہیں اور وہ اس کو شرک بھی نہیں سمجھتے، ورنہ پھر ہر وہ غیر مقلد مشرک قرار پائے گا جو

دینی معاملات میں بغیر مطالبہ دلیل کے کسی پر اعتماد کرتا ہو، اور وہ عملاً ہو رہا ہے۔ لہٰذا اربابِ علم وفضل کا فرض بنتا ہے کہ ان کی اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔

اللہ جزائے خیر دے ہمارے مخدوم جناب مولانا کمال الدین صاحب فاضل جامعہ علوم اسلامیہ واستاذ جامعہ اسلامیہ کلفٹن کراچی کو، جنھوں نے اس خیرخواہی کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ پیش نظر مجالہ میں انہوں نے غلط فہمی کا شکار غیرمقلدین اوران کے پروپیگنڈا سے متاثر افراد کی تشفی وتسلی کا سامان کرتے ہوئے ایسے مسائل سے بحث کی ہے جن میں عام طور پر اسلاف بیزار اور غیرمقلدیت کے مریض اُلجھتے اور اُلجھاتے ہیں۔

اگر بارِ خاطر نہ ہو تو عرض کروں کہ: ہمارے اساتذہ فرماتے تھے کہ سورۂ فاتحہ میں اصالتاً دو ہی مضامین مذکور ہیں، مگر افسوس کہ غیرمقلدین کو دونوں ہی سے اختلاف ہے۔ چنانچہ سورۂ فاتحہ میں ایک مضمون دعا کا ہے، مگر غیرمقلدین دعا سے خائف ہیں، اسی طرح دوسرا مضمون تقلید کا ہے جس کو: ”اھدنا الصراط المستقیم. صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین.“ میں بیان فرمایا گیا ہے، لیکن شومیٔ قسمت! کہ وہ اس سے بھی خفا ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے کہ انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین اور جو ان کے طریق پر ہوں ان کی راہ پر چلو، اور اس راہ پر چلنے کی مجھ سے دعا مانگو، مگر ان کی اُپچ ہے کہ: ”نہیں یہ تو تقلید ہے اور ہم تقلید کو حرام جانتے ہیں!“ اب دیکھئے ائمہ اربعہ کی تقلید کا انکار کرنے والے قرآنِ کریم کا کیونکر انکار کرسکیں گے...؟

اس کتاب کے آخر میں قیاس کے حجتِ شرعیہ ہونے پر بھی مدلل بحث کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قیاس بھی حجتِ شرعی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو مصنف وناشر کی نجاتِ آخرت اور قارئین کی ہدایت وراہ نمائی کا ذریعہ بنائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۱۵/۱/۱۴۲۵ھ

مدیر ماہنامہ بینات کراچی

فہرست مضامین

دیباچہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین

وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ الی یوم الدین، اما بعد!

آج کل جہل کا دور دورہ ہے، اور شبہات کا ایک طوفان برپا ہوا ہے، مگر ان کے حل میں بوجوہ پیچیدگیاں پیش آرہی ہیں، جس کی بڑی وجہ ایک یہ ہے کہ ایمان میں کمزوری اور ضعف کی بناء پر مقاصد پر نظر کم رہتی ہے، ہمتیں پست ہوچکی ہیں اور دین کی اہمیت کم ہوئی ہے، اسی بناء پر ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مشاہدہ پڑھے لکھے طبقہ میں بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ ان کا ارادہ جب عمل کرنے کا نہیں ہوتا ہے تو اشکالات کا سہارا لے کر جان چھڑا لیتے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کے دلوں میں اعتراضات آنا ایک لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلاف سے اس قسم کے شبہات بہت کم مروی ہیں، اور جو منقول ہیں وہ بہت اقل قلیل ہیں، ان کی کتب کا مطالعہ کریں تو ان میں فان قیل قلنا بہت کم ملے گا، تھوڑی سی تقریر ان کے پختہ عقیدہ اور عمل دائم کی بنیاد بننے کے لئے کافی ہوجاتی۔ آج کے دور میں ایسا نہیں ہوتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت تھانوی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا کہ:

''میرا تجربہ ہے کہ جن لوگوں کے پیش نظر کوئی مقصد ہوتا ہے اور وہ اس کے

کام کرنا چاہتے ہیں، ان کو شبہات بہت کم پیش آتے ہیں، اور ذرا سے اشارہ میں رفع ہوجاتے ہیں، سوالات اور شبہات کی بھرمار صرف وہ لوگ کیا کرتے ہیں جن کو کام کرنا نہیں ہوتا۔

یہاں سے دہلی جانے والے کو جب کہیں راستہ میں شبہ ہوجائے تو کسی سے راستہ پوچھتا ہے، تو بقدرِ ضرورت معلوم ہوجانے پر چلنا شروع کردیتا ہے، بہت زیادہ تدقیقات میں نہیں پڑتا، نہ زیادہ قیل وقال کرتا ہے۔ اسی طرح کسی بھوکے آدمی کو کھانا دیا جائے تو وہ بہت سوالات وتدقیقات میں نہیں پڑتا کہ گندم کہاں کا ہے؟ چاول کہاں سے آیا ہے؟ آٹا کہاں پیسا گیا ہے؟ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے کہ کھانا بھوک کو رفع کرنے کے لئے اللہ نے دیا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

حضرات صحابہ کرامؓ کا دین کے معاملات میں یہی رنگ تھا کہ کام کی دُھن لگی ہوئی تھی، گوش بہ آواز رہتے کہ جب کسی کام کا حکم ہو فوراً اس طرف چل دیں۔ اول تو دین کے معاملات میں ان کو شبہات وسوالات پیدا ہی نہیں ہوتے تھے اور جو ہوتے تو ادنیٰ اشارہ اور مختصر تقریر سے کافور ہوجاتے تھے، اور کیوں نہ ہو کہ سچی اور صحیح بات کا یہی طبعی اثر ہے، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"الصدق طمانية والكذب ريبة."

یعنی سچی بات اطمینانِ قلب کا سبب بنتی ہے اور جھوٹ شک وشبہ کا۔

ایک طرف بات سیدھی سچی، دوسری طرف قبول اور اطاعت کا جذبہ قوی. اس لئے شبہات کی کوئی عمر ہی نہ ہوتی تھی۔

حضرت صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے درمیان ایک معاملہ میں اختلاف رائے پیش آیا۔ صدیق اکبرؓ نے دو مرتبہ فرمایا: "والله هو خير! والله هو خير!" یعنی خدا کی قسم خیر اسی میں ہے، فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ ان کے کلمات سے

مجھے بھی اس معاملہ میں شرحِ صدر ہوگیا جس میں حضرت صدیقؓ کا شرحِ صدر پہلے ہوچکا تھا اور اختلافِ رائے ختم ہوگیا۔

یہ ظاہر ہے کہ "واللہ ھو خیر!" نہ کوئی معاملے اور مسئلے کی دلیل ہے، نہ کسی بحث کا جواب، مگر طالبِ حق کے لئے غور وفکر کی دعوت ہے، وہ ہی اس جگہ کافی ہوگئی۔

باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے، عادۃً وہ دلائل بیان نہیں کرتا، لمبی تقریر نہیں کرتا، بیٹے کی مصلحت کو مختصر لفظوں میں بتلاتا ہے، وہی کافی ہوجاتی ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات عموماً اسی رنگ کے ہوتے ہیں۔" (مجالس حکیم الامتؒ ص:۱۲۸، ۱۲۹)

دوسری وجہ آپس کی ضد اضدی ہے، جس کا مطلب مدمقابل کو ہرانا اور اپنی بات کو بہرحال ثابت کرنا ہوتا ہے، خواہ وہ حق ہو یا نہ ہو، اس پر کوئی خاطرخواہ نتیجہ مرتب ہوتا ہو یا نہ ہو، یہ ایسی چیز ہے جس سے حق کو ظاہر اور طاقتور نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ لوگوں پر حق کو مشتبہ کردیا جاتا ہے، جس سے لزوماً گمراہی پیدا ہوتی ہے، اس حدیث میں اس کی تصریح فرمائی گئی ہے:

> "عن ابی امامة رضی اللہ عنه قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم: ما ضل قوم بعد ھدیً کانوا علیه الا اوتوا الجدل. ثم قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ھذہ الآیة: ما ضربوہ لک الا جدلًا بل ھم قوم خصمون. رواہ احمد والترمذی وابن ماجة."

(مشکوٰۃ ص:۳۱)

ترجمہ:......"حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ہدایت پانے اور ہدایت پر قائم رہنے کے بعد کوئی قوم گمراہ نہیں ہوئی مگر اس وقت جبکہ اس میں جھگڑا پیدا ہوا۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے یہ آیت پڑھی: وہ تمہارے لئے مثال بیان نہیں کرتے
مگر جھگڑنے کے لئے، بلکہ وہ جھگڑالو قوم ہیں۔''

اس حدیث میں جہاں ایک طرف آپس کے عناد کو بنیادِ ضلالت ٹھہرایا گیا ہے، وہیں اس میں دوسری طرف اس کی طرف اشارہ ہے کہ جب شرعی مسائل میں جاہل لوگ اور ہرکس و ناکس اپنی عقل کے تیر چلانے لگتے ہیں تو گمراہی جنم لیتی ہے، کیونکہ ہر امت کے شروع میں راسخ العلم لوگ ہوتے ہیں، پھر آگے چل کر بتدریج سطحی لوگ علم کے وارث بنتے ہیں، جیسے کہ مشاہدہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین اور متأخرین کے اختلافات میں بڑا نمایاں فرق ہوتا ہے، سابق الذکر علماء کا اختلاف تلاشِ حق کے لئے ہوتا ہے، اپنی ذاتی غرض کے لئے نہیں، جبکہ مؤخر الذکر لوگوں کے درمیان اختلاف کی نوعیت جھگڑے کی ہوتی ہے، یہ رنگ مذاہب و مناظروں کی زنجیروں کی لڑیوں میں بآسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر اسلاف کو مناظرہ میں خصم کی بات مضبوط محسوس ہوتی تو فوراً اپنی رائے سے رجوع فرماتے۔ ائمہ اربعہ اور ان کے شاگردوں وصحابہ کرامؓ کی رجوعات کی بے شمار روایات ہیں، جبکہ عصرِ حاضر میں مناظر حضرات اپنے مدمقابل سے بحث کرنے سے پہلے ہی اپنی جیت کے اشتہارات تیار کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس لئے حضرت تھانوی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

''آج کل مجھے مناظروں سے نفرت ہے اور طالب علمی کے زمانہ میں بہت مناظرے کرتا تھا، سبب یہ ہے کہ آج کل مناظروں میں تحقیقِ حق تو مقصود رہا ہی نہیں، صرف بات کی پچ کرنے پر آدمی مجبور ہوتا ہے، اس سے مجھے نفرت ہے۔''

(مجالس حکیم الامت ص:۲۷۹)

الحمدللہ! راقم کا مزاج بھی کچھ اس طرح ہے، وجہ مذکور کے علاوہ جو چیز اور خرابی مجھے مناظروں میں نظر آئی ہے وہ بے اعتدالی ہے کہ مناظر آدمی عموماً حدِ اعتدال

پر قائم نہیں رہ سکتا ہے۔ غیر مقلدین کے عام شبہے اسی قسم میں داخل ہیں، ان میں اکثریت خصوصاً جاہل طبقہ طلبِ حق کے لئے اعتراضات نہیں اٹھاتے ہیں، اور نہ ہی تسلی بخش جواب ملنے پر ان کا مقصد عمل کرنا ہوتا ہے، بلکہ محض اسکاتِ خصم اور شرمندہ کرنا ان کا بڑا مشغلہ ہوتا ہے، ورنہ داڑھی کی متفقہ سنت بلکہ سنن انبیاء علیہم السلام کا اہم عنصر کو نظر انداز کرنا، بغیر ٹوپی کے نماز پڑھنا جبکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں، غیر اسلامی لباس پہننا اور اس پر فخر کرنا، انگریزی بال رکھنے کے باوجود نماز میں رفع یدین پر اس طرح زور دینا جیسا کہ اس کے بغیر ایمان کامل ہوتا ہی نہیں ہے، حالانکہ ان کے پیشوا ابن حزم نے تصریح کی ہے کہ رفع یدین اور ترکِ رفع دونوں سنت ہیں (کما فی المحلی ج:۳،۴ ص:۲۳۵ مطبع دار الآفاق الجدیدۃ بیروت):

"فان رفعنا صلینا کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی، وان لم نرفع فقد صلینا کما کان علیہ السلام یصلی."

ترجمہ:...... "اگر ہم نے ہاتھ اٹھائے تو ہم نے اسی طرح نماز پڑھ لی جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے اور اگر ہم نے ہاتھ نہیں اٹھائے تو بھی ہم نے ایسی ہی نماز پڑھ لی جیسے آپ علیہ السلام پڑھتے تھے۔"

تفصیل میری دوسری کتاب "تشریحاتِ ترمذی" (جلد دوم) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح قیام کی حالت میں کہنیوں کو پکڑنا یا اس سے بھی اوپر ہاتھ رکھنا جبکہ اس کا کسی بھی حدیث میں ثبوت نہیں، یہ کس قسم کا عمل ہے؟ اور کیسی طلبِ حق ہے؟ مزید ستم یہ کہ ایسا نہ کرنے والوں پر لعن طعن کرنا، جدالِ ناحق نہیں تو کیا ہے...؟

تیسری وجہ ذوقِ سلیم اور اسلاف کے درست ذوق سے بے راہ روی اور

بے خبری ہے کہ ان میں اس قسم کے اختلافات کے باوجود ہم آہنگی اور اخوتِ اسلامی رہتی تھی، ان کے درمیان بعد اور دوری حسبِ اختلاف رہتی تھی، اگر اختلاف کی نوعیت سنگین ہوتی، مثلاً عقائد کے مسائل میں، تو اس کا تعلقات پر اثر بھی پڑتا تھا، مگر آداب اور اجتہادی مسائل میں ان کا اختلاف جدال کی حد تک کبھی نہ پہنچتا، ایک ہی مسجد میں کوئی شخص رفع یدین کر رہا ہوتا اور کوئی عدمِ رفع پر عمل کرتا، کوئی تطبیق کرتا اور کوئی عدمِ تطبیق وغیرہ وغیرہ۔

چنانچہ امام عبداللہ بن مسلم بن قتیبہؒ فرماتے ہیں:

”وبنحو هذا السبب اثبت اُبیّ بن کعب فی مصحفه، افتتاح دعاء القنوت وجعله سورتین لأنه کان یری رسول الله صلی الله علیه وسلم یدعو بهما فی الصلوٰة دعاءً دائماً فظن انه من القرآن.

واما التطبیق فلیس من فرض الصلوٰة وانما الفرض الرکوع والسجود لقول الله عز وجل: ”ارکعوا واسجدوا.“ (الحج). فمن طبّق فقد رکع، ومن وضع یدیه علی رکبتیه فقد رکع، وانما وضع الیدین علی الرکبتین او التطبیق من آداب الرکوع. وقد کان الاختلاف فی آداب الصلوٰة، فکان منهم من یقعی، ومنهم من یفترش، ومنهم من یتورک، وکل ذالک لا یفسد الصلوٰة وان کان مختلفاً.“

(تاویل مختلف الحدیث ص:۳۳۶، مطبوعہ دارالفکر)

ترجمہ:...... ”یعنی اس وجہ مذکور کی بناء پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے مصحف کے شروع میں دعائے قنوت

لکھ کر اس کی دو سورتیں بنائی ہیں، کیونکہ انہوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ کے لئے اسے نماز میں پڑھتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا، جس سے وہ یہ سمجھے کہ یہ بھی دیگر سورتوں کی طرح قرآن کا حصہ ہے۔

رہی تطبیق (دونوں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے درمیان حالتِ رکوع میں رکھنا) تو وہ فرائض نماز میں نہیں۔ فرض تو فقط رکوع و سجود ہے کیونکہ اللہ عزوجل نے فرمایا: ''رکوع اور سجدہ کرلیا کرو۔'' تو جس نے تطبیق کی، اس نے رکوع کرلیا (اور جس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ لئے تو اس نے بھی رکوع کرلیا) بلاشبہ یہ دونوں رکوع کے آداب میں سے ہیں، اور آدابِ نماز میں تو اختلاف تھا ہی، پس ان میں بعض اقعاء کرتے تھے (دونوں سجدوں کے درمیاں ایڑیوں کے بل بیٹھنا)، اور بعض افتراش (جیسے حنفی مرد قعدہ میں بیٹھتے ہیں) اور بعض تورک کرتے تھے (جیسے حنفی عورتیں بیٹھتی ہیں)، ان میں سے کوئی چیز مفسدِ صلوٰۃ نہیں گو کہ اختلافی ہیں۔''

بلکہ یہ پوری کتاب اسی موضوع پر ہے کہ بظاہر بہت سی احادیث و اعمال متعارض لگتے ہیں اور ان سے شبہات جنم لیتے ہیں مگر درحقیقت وہاں کوئی تضاد نہیں ہوتا ہے۔

ویسے بھی ادنیٰ تامل سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر الگ الگ ارشادات فرمائے ہیں، جیسا کہ آگے چل کر انشاء اللہ اس پر اجمالاً بحث ہوگی، لہٰذا جہاں کسی صحابی نے یا کسی امام نے ایک قول کو ترجیح دی ہو تو دوسرے کو غلط گردانا انصاف کی بات نہیں، کما ستبین!

مگر جب سے پریس کی آزادی اور اشاعت کی سہولیات عام و آسان ہوگئی ہیں، اس سے یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ ہر کس و ناکس مفتی بن گیا ہے، پھر غیر ذمہ دار علماء نے یا شہرت اور حبِ جاہ کے نشے میں دھت واقفین نے وہ مسائل بھی عوام کے سامنے پیش کردیئے، بلکہ عوام سے ان پر فیصلہ طلب کیا، جن کے ابجد سے بھی عوام واقفیت نہیں رکھتے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مکروہ و حرام اور مباح و مندوب اور فرض کے درمیان فرق نہ کرسکنے والے بھی بخاری و مسلم کے حوالے دینے لگے اور امت کو اس پُرفتن دور میں ایسے مسائل میں الجھایا کہ ضروریاتِ دین سے ان کی توجہ یکسر ہٹ گئی۔

اگر کوئی شخص بینک میں ملازمت کرتا ہو، پینٹ شرٹ پہنتا ہو اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت دن میں دو دفعہ چہرے سے اتارتا ہو یا اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہو، وہ تو ان کا ساتھی ہوسکتا ہے، مگر جو رفع یدین نہ کرے یا حالتِ قیام میں کندھوں تک ہاتھ باندھ کر کھڑا نہ ہوتا ہو، گو کہ وہ باقی سنتوں، وضع قطع میں سنت کے موافق ہو، ان کا دوست نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر یہ لوگ الاہم فالاہم کے اصول کے پیش نظر تعلیم کا طریقہ اختیار کریں تو اس سے ان کو بھی فائدہ ہوگا اور امت کو بھی، اس کے برعکس وہ لوگ جو خود کو فقہ حنفی کی طرف منسوب کرتے اور ان مسائل میں غلو کرتے ہیں، ان کو بھی انصاف کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص رفع یدین کرتا ہے تو ایک سنت عمل سے گزر رہا ہے، گو کہ ہمارے نزدیک وہ سنت متروک یا مرجوح ہے، مگر اس کو جھگڑے کی بنیاد نہیں بنانا چاہئے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تعجب ہے کہ بعض اس زمانہ کے مولوی جماعتِ ثانیہ پر بے طرح زور لگا رہے ہیں، خدا جانے ان کی عقل کہاں گئی؟ نہ زمانہ کے حال سے واقف ہیں، نہ جماعتِ ثانیہ کے مآل اور برے اثر پر نظر کرتے ہیں، فقہ کی کسی ایک روایت کو ذرا موافق پاکر اسے گھڑ مڑھ کر سامنے کردیتے ہیں، حنفی حنفی کہلاتے ہیں اور امام کی بات

جو بدیہی ہے اس کو نہیں مانتے، حنفی کی خلاصی کے لئے تو یہی کافی ہے کہ ہمارے امام کا یہ مذہب نہیں، لیکن باوجود مرجحاتِ مذہبِ امام اور مؤیداتِ کراہت کے استحباب اور اولویت جماعتِ ثانیہ پر اَڑ رہے ہیں۔

رفع یدین میں تو باوجود احادیثِ صریحہ کے امام کی آڑ پکڑیں اور کہیں کہ امام کا مذہب نہیں، اور خوب جمیں اور حنفیت کا دعویٰ کریں، اگر کوئی غیر مقلد رفع یدین کرے تو اخراج من المسجد کا حکم دیں، تاکہ پاس والوں کی نماز خراب نہ ہو، اور یہاں امام کی بات نہ مانیں بلکہ اِدھر اُدھر کی باتیں بنائیں اور حدیث کا بہانہ لیں، حدیث میں نہ صراحت ہے نہ پوری تائید۔

رفع سبابہ (اشارہ) پر تو انگلی اڑادیں، کیونکہ خلاصہ کیدانی میں حرام لکھا ہے، لیکن جماعت کو بار بار کریں کہ سہولت للعوام ہے:

ببیں تفاوت رہ از کجا ست تا کجا!

معلوم ہوا کہ وہاں بھی امام کی وجہ سے نہ جمتے تھے بلکہ ہوائے نفس سے، ورنہ یہاں بھی تو وہی امام ہیں! کیوں پورے مقلد نہیں بنتے؟''

(الورد الشذی ص:۵۲ الجماعة الثانية)

دیکھا آپ نے کہ دونوں طرف افراط وتفریط سے کام لیا جارہا ہے، جو حق پرستی کی نہیں بلکہ خواہشاتِ نفسانی کی دلیل ونشانی ہے، حق پرست اور مخلص لوگ اصول پر چلتے ہیں، تاہم غیر مقلدین اور مقلدین میں واضح فرق یہ ہے کہ مقلد اگر خود کسی مسئلہ کو نہیں جانتا تو وہ ذی علم شخص اور بااعتماد عالم کے فتوئ پر چلنا، اپنی کوتاہیٔ علم کی وجہ سے جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے، جبکہ غیر مقلد یہ طے کرچکا ہے کہ وہ کسی کی تقلید نہیں کرے گا، یعنی نص کے علاوہ کسی کی بات پر باور نہیں کرے گا، چونکہ آج اول تو ہر آدمی کے لئے تمام ذخیرۂ احادیث وآیاتِ قرآنیہ کا علم ناممکن ہے، پھر ان کا مطلب سمجھنے کے لئے اور تعارض کے حل اور صحیح وسقیم روایات جاننے کے لئے جس ذہانت، علمی

متانت اور محنت کی ضرورت ہے جس سے آدمی خود حکم مستنبط کر سکے، محال اور خواب و خیال کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے لوگ نہ خود کچھ کر سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو کام کرنے دیتے ہیں، اس لئے یہ ایسے ایسے نایاب اشکالات و سوالات اٹھاتے ہیں جن کے دلائل عام طور پر کتبِ فقہ میں اس لئے نہیں ہوتے ہیں کہ وہ سلف صالحینؒ اور ائمہ المجتہدینؒ کے مسلّمات میں سے ہوتے ہیں، فقہاء نے عام طور پر ایسے مسائل کے دلائل کو اس لئے غیر ضروری سمجھا کہ ان کا کوئی منکر نہ تھا، پھر بھلا ایسے بدیہی مسائل مبرہن کرنا اور دلائل میں لگنا ضیاعِ وقت کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟ خاص کر وہ مسائل جو آداب کے زمرے میں آتے ہیں۔

فقہ کی اہمیت اور فقہاء کا مقام:

"عن معاوية قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من يرد الله به خيراً يفقههُ في الدين، وانما انا قاسم والله يعطي."

(بخاری ومسلم، مشکوٰۃ شریف ص:۳۲، کتاب العلم، الفصل الاول)

ترجمہ:...... "حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے لئے اللہ تعالیٰ بھلائی کا اراد کرتا ہے، اسے دین کی سمجھ عطا فرمادیتا ہے، اور میں (علم کو) تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ (فہم) عطا کرنے والا ہے۔"

"وعن ابي هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الناس معادن كمعادن الذهب والفضة، خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا."

(مشکوٰۃ ص:۳۲ بحوالہ مسلم)

ترجمہ:......"اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی کان ہیں جس طرح سونے اور چاندی کی کان ہوتی ہے، جو لوگ ایامِ جاہلیت میں بہتر تھے وہ زمانہ اسلام میں بھی بہتر ہیں اگر وہ سمجھیں (یعنی فقاہت حسب ونسب پر مقدم ہے)۔"

"وعن ابی سعید الخدری قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان الناس لکم تبع وإنّ رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفققھون فی الدین، فاذا اتوکم فاستوصوا بھم خیراً۔" (مشکوٰۃ ص:۳۴)

ترجمہ:......"اور حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگ تمہارے (یعنی صحابہؓ کے) تابع ہیں اور بہت سے لوگ علم دین سمجھنے اطرافِ عالم سے تمہارے پاس آئیں گے، لہٰذا جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا (یعنی خیرخواہ ومشفق بن کر پڑھاؤ)۔"

"وعن ابن مسعود قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: نضّر اللہ عبداً سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا وادّاھا فرب حامل فقه غیر فقیه، ورب حامل فقه الی من ھو افقه منه۔" (مشکوٰۃ ص:۳۵)

ترجمہ:......"اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندہ کو تازہ رکھے جس نے میری کوئی بات سنی اور اسے یاد

رکھا اور ہمیشہ یاد رکھا اور اس کو جیسا سنا ہو، ہو بہو لوگوں تک پہنچایا، کیونکہ بعض حامل فقہ (یعنی علمِ دین کے حامل) فقیہ نہیں ہوتے، اور بعض حامل فقہ ان لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں جو ان (حاملین) سے زیادہ فقیہ (سمجھدار) ہوتے ہیں۔"

دیکھئے! اس حدیث میں صاف طور پر بتلایا گیا کہ حدیث محفوظ کرنا اور یاد کرنا اور شے ہے، اور اسے سمجھنا اور اس کا مطلب نکالنا الگ کام ہے۔ کبھی ایک آدمی کو حدیث تو معلوم اور یاد ہوتی ہے مگر وہ اس کا صحیح مطلب نہیں جانتا ہے، گو کہ وہ اس کا مدعی ہو، مگر وہ حدیث جب فقیہ کے پاس پہنچتی ہے تو وہ اس کا صحیح مطلب سمجھ لیتا ہے، اور اس سے احکام مستنبط کرتا ہے، گویا یہاں دو کام ہیں: ایک الفاظ یاد کرنا اور ان کی حفاظت کرنا، اور دوسرا ان احادیث کی صحیح مرادیں جاننا۔ اول الذکر محدثین کا کام ہے، جبکہ دوسرا فقہاء کا وظیفہ ہے۔

حافظہ اور ذکاوت میں فرق اور اللہ کا نظامِ حکمت:

دراصل اللہ جل شانہ کا نظام کچھ اس طرح ہے کہ عالم میں حسبِ ضرورت و مصلحت اشیاء پیدا فرماتا ہے، جب اور جہاں جس چیز کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، اسی مقدار میں فیض فرماتا ہے۔ زمانۂ آدم علیہ السلام سے لے کر تا حال زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، جب انسان کم تھے تو زمین کی پیداوار قلیل تھی، مگر جیسے جیسے انسانی آبادی اور ضروریات میں اضافہ ہوتا رہا، اسی تناسب سے زمینی پیداوار بڑھتی گئی، ایک زمانہ میں خاندانی منصوبہ بندی والے پریشان تھے کہ اگر "انسانی پیداوار" کی یہ شرح برقرار رہی تو ملک ان کی ضروریات کہاں سے پوری کرے گا؟ مگر آج ہر ایک کے علم میں ہے کہ وہی غریب پاکستان جو گندم میں بھی امریکہ کا محتاج رہتا تھا، خود لاکھوں ٹن گندم بیرون ممالک کو برآمد کرتا ہے، بعض لوگوں

کو قربانی کے جانوروں کے کم ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، مگر مشاہدہ ناطق ہے کہ قربانی کی شرح اضافی کے ساتھ ساتھ یہ شرح بھی بڑھتی رہتی ہے، اسی ضمن میں ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک عجیب بات تحریر فرمائی ہے:

”یذکر (اللہ) تعالیٰ نعمه علی عبیده التی لا تعد ولا تحصی فی انزاله القطر من السماء بقدر ای بحسب الحاجة لا کثیراً فیفسد الارض والعمران، ولا قلیلاً فلا یکفی الزروع والثمار، بل بقدر الحاجة الیه من السقی والشرب والانتفاع به حتیٰ ان الاراضی التی تحتاج ماءً کثیراً لزروعها ولا تحتمل دمتها انزال المطر علیها یسوق الیها الماء من بلاد اخریٰ کما فی ارض مصر، ویقال لها الارض الجُرز یسوق اللہ الیها الماء النیل معه طین احمر یجترفه من بلاد الحبشة فی زمان امطارها، فیأتی الماء یحمل طیناً احمر فیسقی ارض مصر ویقر الطین علیٰ ارضهم لیزرعوا فیه لأن ارضهم سباخ یغلب علیها الرمال فسبحان اللطیف الخبیر الرحیم الغفور.“

(تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۳۵۰، قدیمی کتب خانہ)

ترجمہ:...... ”اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ان لاتعداد نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں، جو بصورت بارش کے قطروں میں اُسی مقدار میں نازل فرماتے ہیں جس سے حاجت پوری ہو، جو نہ تو اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ زمین اور آبادی کو برباد کردے اور نہ اتنی کم جو کھیتی اور پھلوں کے لئے ناکافی ہو، بلکہ آب پاشی، پینے اور دیگر

فائدوں کے مطابق ہوتی ہے، حتیٰ کہ جن اراضی کی فصلوں کو پانی
کی بہت ضرورت ہو اور ان کے صحراؤں میں بارش کا احتمال نہ ہو
تو وہاں کے لئے دوسری جگہوں سے پانی پہنچاتا ہے، جیسے مصر کی
زمین، اس کو بنجر زمین کہتے ہیں، اللہ وہاں دریائے نیل کا پانی
پہنچاتا ہے، جس میں سرخ مٹی ہوتی ہے جو بارشوں کے موسم میں
حبشہ کی سرزمین سے کرید کر پانی ساتھ لاکر مصر کی زمین میں
ملادیتا ہے، پھر وہ کیچڑ ان کی زمین (ریت) پر باقی رہتی ہے
تاکہ وہ اس سے اپنی شور زمین جس پر ریت و بجری غالب رہتی
ہیں، فصلیں اُگاسکیں۔ پس پاک ہے لطیف الخبیر الرحیم الغفور۔''

اسی پر قیاس کرکے زمین کے مختلف خطوں، اقلیموں اور ان پر رہنے والے انسانوں میں باہمی واضح تفاوت ہے، حتیٰ کہ اسی حکمت کا تقاضا ہے کہ سارے لوگ ایمان پر جمع نہیں کئے گئے۔ ابوسعود رحمہ اللہ نے اس موقع پر فرمایا ہے: "ولو لا الحمقاء لبطلت الدنیا." "اگر احمق لوگ نہ ہوتے تو دنیا کا نظام برباد ہوجاتا۔ کیونکہ اگر سارے مطیع اور زاہد و عابد بن کر مساجد و مدارس میں بیٹھ جاتے تو زراعت، حرفت اور صنعت کا کام ٹھپ ہوکر رہ جاتا، اللہ کی حکمت کو دیکھئے! ایک شخص چند پیسوں کے لالچ میں دن و رات کام کرتا رہتا ہے، مگر اس کو نماز کی فرصت نہیں ملتی اور جب مرتا ہے تو ساری دولت دوسروں کی میراث بن جاتی ہے، حتیٰ کہ بیوی بھی اس کی نہیں رہتی، مگر پھر بھی وہ آخرت سے غافل رہتا ہے، (اعاذنا اللہ منہا!

اطباء کی تصریح کے مطابق خشک مزاج کا انسان تیز حافظے کا مالک ہوتا ہے، جبکہ مرطوب مزاج میں ذکاوت ہوتی ہے، اس لئے اطباء کہتے ہیں کہ حافظہ اور ذکاوت دونوں ایک ہی شخص میں جمع نہیں ہوتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا مدار جن دو چیزوں پر رکھا گیا ہے وہ باہم متضاد ہیں، پانی کی قلت کی وجہ سے حافظہ اچھا ہوتا ہے۔ اگر غور کیا

جائے تو ماوراء النہر، حجاز اور ہندوستان و شام اور عراق کے لوگوں میں یہی فرق نظر آئے گا کہ اول الذکر علاقے خشک ہونے کی وجہ سے حفاظ کے منابع ہیں، جبکہ آخر الذکر اذکیاء کا مولد ہیں، امام اصمعی رحمہ اللہ کا حال اس کی واضح مثال ہے، اللہ نے ان کو غضب کا حافظہ دیا تھا، کہا جاتا ہے کہ دواوین عرب کے علاوہ ان کو سولہ ہزار قصیدے یاد تھے، اگر اس کو مبالغہ پر بھی محمول کیا جائے تو بھی مضبوط حافظہ کی بنیادی بات بہرحال صحیح ہے۔

ابو العباس ایک بادشاہ ہے، جو کہ ایک مرتبہ قصیدہ کو سن کر یاد کرلیتا تھا، اس نے اپنے زمانے کے شعراء کو مات کردیا تھا کہ جو شاعر قصیدہ سنانے کے لئے آتا اس سے یہ شرط کرلیتا تھا کہ تم اس شرط پر انعام کے مستحق ہوگے کہ کسی اور نے اس کو نہ کہا ہو، یہ تو خود ایک مرتبہ سننے سے یاد کرلیتا تھا اور اس کا غلام دو دفعہ سننے سے، اور اس کی باندی تین بار سننے سے یاد کرلیتی تھی۔ تو قصیدہ سن کر بادشاہ انعام دینے سے بچنے کے لئے ان کو شواہد کے طور پر پیش کیا کرتا تھا، مگر اصمعی رحمہ اللہ نے آکر اس کو خراب کیا، یہ ایک قصیدہ سنگ مرمر کے پتھر پر لکھ کر لایا جس کو نہایت سخت الفاظ میں یعنی مشکل عبارت میں بنالیا تھا، اصمعی یہ قصیدہ لے کر ایک بدوی اور جنگلی کی شکل میں آیا، اور بادشاہ سے کہا کہ: میں فلاں ملک کا دیہاتی ہوں اور بادشاہ کے لئے مدحیہ قصیدہ لایا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ قصیدہ مدحیہ کو سونے سے تول کردے گا اور چونکہ ہم بدوی لوگ ہیں، ہمارے پاس کوئی کاغذ نہیں، اس لئے ایک پتھر پر لکھ کر لایا ہوں، تو ہر شعر پر ان تینوں سے سوال کرتا تھا (کہ پہلے تو نہیں سنا ہے، غریب المعنی اور غیر مستعمل الفاظ ہونے کی بناء پر بادشاہ یاد کرنے سے قاصر رہتا تو مجبور ہوکر نفی میں جواب دیتا، اس سے پہلے تو ان کی عادت یہ تھی کہ جب بھی کوئی شاعر پڑھتا تو بادشاہ کو یاد ہوجاتا، تو جب شاعر فارغ ہوتا، بادشاہ دعویٰ کرتا کہ یہ تو ہم نے پہلے بھی سنا ہے اور خود سنادیتا پھر دو دفعہ سن کر اس کا غلام یاد کرکے سنادیتا، اور پھر باندی سناتی جس پر شاعر انعام

سے محروم ہوجاتا)۔ بالآخر یہ قصیدہ سنا کر سونا لے گیا اور بادشاہ کو دینا پڑا، مگر بادشاہ بھی ہوشیار تھا، اس کو خیال آیا کہ یہ اصمعی ہی ہوگا، چنانچہ تحقیق وتفتیش پر معلوم ہوا کہ وہی ہیں۔

یہ تو ان کے حافظے کی بات ہوئی، لیکن علمی ذکاوت میں ان کو اس قدر وافر حصہ عطا نہیں ہوا تھا، اس لئے خلیل ان کو علم عروض سکھانے میں ناکام رہے۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ اصمعی، خلیل بن احمد کے پاس آئے اور علم عروض سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، لیکن جب انہوں نے بھانپ لیا کہ طالب میں اس فن کی صلاحیت و استعداد نہیں ہے تو ان کو اس سے باز رہنے کا مشورہ دیا، اور اس کے لئے جو لطیف انداز انہوں نے اختیار کیا اس سے خلیل کے ذوق کا پتہ چلتا ہے، انہوں نے درج ذیل شعر کی تقطیع کے لئے ان سے کہا:

اذا لم تستطع شیئاً فدعہ

وجاوزہ الی ما تستطیع

ترجمہ:......"جب تم سے ایک کام نہ ہوسکے تو اس کو چھوڑ دو، اور اس کام میں لگ جاؤ جو تمہارے بس میں ہو۔"

خلیل نے تو یہ فن لوہار کے ہتھوڑے کی آواز سے اخذ کر کے مدون کیا، مگر اصمعی جیسا تیز حافظے والا بنا بنایا فن نہ سمجھ سکیں، اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تیز فہم الگ شے ہے اور تیز حافظہ دوسری چیز ہے۔

(تقریر ترمذی للمدنی رحمہ اللہ ص:۴۰، وقاموس وحید ص:۳۰ بحوالہ ضحی الاسلام)

ہر دور کے ماہرین اس پر متفق ہیں کہ انسانی ملکات سب متحد نہیں ہوتے ہیں، اور ہر آدمی اپنے فہم کے مطابق اور مزاج کے مناسب کام میں ہی ترقی کرسکتا ہے۔ اگر ایک آدمی جہادی ذہن رکھتا ہے تو اسے ذلت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور جو غلامانہ ذہنیت کا حامل ہے تو اسے جہاد پر آمادہ کرنا فضول ثابت ہوتا ہے

خلق اللہ للحروب رجالًا
ورجالًا لقصعة وثرید

ترجمہ:......''اللہ نے کچھ لوگ جنگوں کے لئے پیدا
کئے ہیں، اور کچھ ثرید اور کھانے کے پیالے کے لئے۔''

علیٰ ہذا القیاس! زندگی کے تمام شعبوں پر یہ ضابطہ منطبق ہوتا ہے، مگر مذکورہ مثال دلالتِ حال کے پیش نظر ذکر کردی۔

جس طرح ایک حافظ قرآن کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ مفسرِ قرآن ہو، اسی طرح مفسرِ قرآن کے لئے بھی یہ لازمی نہیں کہ وہ حافظ بھی ہو۔ روزمرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ لاکھوں لوگ قرآن کے حافظ ہیں اور بے شمار تعداد میں لوگ ناظرہ قرآن بآسانی پڑھ لیتے ہیں، مگر مع ہذا وہ ایک آیت کے مطلب سمجھنے پر بھی قادر نہیں ہوتے ہیں، اللہ نے ہر شعبۂ اسلام اور ہر پہلو کے لئے لوگوں میں الگ الگ صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، کسی کو حافظ الحدیث بنایا تو کسی کو فہمِ حدیث اور مطلبِ حدیث پر قادر بنایا، کسی کو تو حافظ قرآن کردیا تو کسی تفسیر و فہم القرآن کا ملکہ عطاء فرمایا، پھر جس دور میں، جس شعبے کی زیادہ ضرورت تھی اسی کے مطابق صلاحیتیں نازل فرمائیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں اخذ دین اور اس کے پھیلانے کی ضرورت تھی تو ایک طرف ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے مکثرین حدیث مبعوث فرمائے اور دوسری جانب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جیسے مجاہد۔

پھر تابعین اور تبع تابعین کے دور میں احادیث یاد کرنے اور ان سے مسائل اخذ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے لئے حفاظ وفقہاء کا انتظام فرمایا، جب تاتاریوں نے ذخائرِ علم کو غیر معمولی نقصان پہنچایا تو اللہ نے اس کے بعد کیسا انتظام فرمایا! آج علوم کی وقیع کتب کس دور کی ہیں؟

گویا ہر ضرورت کے وقت اللہ مجددین پیدا فرماتے ہیں، فالحمد للہ علیٰ ھذہ

الحمد!

تاہم یہ مذکورہ قاعدہ اکثریہ ہے، کلیہ نہیں، یہ بھی ہوا ہے کہ اللہ نے کسی کو دونوں نعمتوں سے بہرہ مند فرمایا ہو، مگر ایسا بہت کم دیکھنے میں یا سننے میں آرہا ہے، ہاں! تیز فہم اور تیز حافظ علی الکمال کسی میں جمع نہیں ہوتے کہ اللہ جل جلالہٗ کی سنتِ جاریہ یہی ہے، مگر ہاں بطورِ خرقِ عادت امور بھی عالم میں بکثرت رونما ہوتے ہیں جو اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔

عام ضابطہ یہی ہے کہ معنی اور مرادِ حدیث سمجھنا فقہاء کا کام ہے، اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وکذالک قال الفقهاء وهم اعلم بمعانی الحدیث." (ترمذی ج:۱ ص:۱۹۳، باب غسل المیت)

ترجمہ:......"مذکورہ حدیث کا یہی مطلب فقہاء نے بیان کیا ہے اور فقہاء ہی معانی حدیث کو بہتر سمجھتے ہیں۔"

لہٰذا فقہاء کے بیان کردہ احکام کو خلافِ شریعت کہنا حماقت اور مذکورہ مسلّمہ اصول سے جہالت اور ناواقفیت کی نشانی ہے۔

فقہ کیا ہے؟ اور فقہاء کون ہیں؟

"فقہ" لغت میں سمجھ بوجھ کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں قرآن و حدیث کی نصوص سے احکام و مسائل مستنبط کرنے کو۔ ایسے لوگوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دور میں "قراء" کہا جاتا تھا، بعد میں "فقہاء" کے نام سے مشہور ہوگئے، اس سلسلہ میں عبدالرحمٰن بن خلدون فرماتے ہیں:

"فقہ، انسان کے افعال کے بارے میں اللہ کے احکام کی اس حیثیت سے معرفت کا نام ہے کہ وہ واجب ہیں یا حرام؟ مستحب ہیں یا مکروہ؟ اور مباح ہیں یا نہیں؟ یہ باتیں قرآن و حدیث سے اور شرعی دلائل سے لی جاتی ہیں جو شارع علیہ

السلام نے ان کے پہچاننے کے لئے قائم کئے ہیں۔ جب ان دلائل سے احکام نکالے جاتے ہیں تو انہیں ''فقہ'' کہا جاتا ہے۔ سلف بھی انہیں احکام سے دلائل نکالا کرتے ہیں اور اختلاف پیدا ہو جایا کرتا تھا، بلکہ اختلاف کا رونما ہونا یقینی ہے کیونکہ اکثر دلائل قرآن پاک کی آیتیں ہیں اور قرآن عربی میں ہے، عربی زبان کے الفاظ متعدد معنی کا احتمال رکھتے ہیں، اس لئے قرائن سے کسی معنی کی تعین کرنی پڑتی ہے، لہٰذا اختلاف کے بغیر چارہ نہیں (گویا قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا ہی استنباط کی دلیل اور مقصد ہے)۔

علاوہ ازیں ثبوت میں سنت کے بھی مختلف طریقے ہیں اور اس کے اکثر احکام بظاہر ٹکرا جاتے ہیں، اس لئے ترجیح کی ضرورت پیش آتی ہے، جہاں سے اختلاف پیدا ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ غیر قرآنی دلائل میں بھی اختلاف کے بغیر چارہ نہیں (یعنی قرآن و حدیث دونوں کے مطالب اخذ کرنے کے لئے قرائن و ترجیح کی ضرورت ہے، جس کی وجہ سے اختلاف ناگزیر ہو جاتا ہے)۔

علاوہ ازیں نت نئی باتیں رونما ہوتی رہتی ہیں، جو کسی قرآنی دلیل کے گھیرے میں نہیں آتیں، اس لئے انہیں کسی ادنیٰ سی مشابہت کی وجہ سے کسی دلیل کے دائرے ہی میں بند کرنا پڑتا ہے۔

یہ تمام اشارے ان اختلافات کی طرف کئے گئے ہیں، جو یقیناً واقع ہوا کرتے ہیں، اسی وجہ سے سلف اور ان کے بعد ائمہ کرام میں اختلافات پیدا ہوئے۔

پھر تمام صحابہ مفتی نہ تھے، اور نہ تمام صحابہ سے دین لیا جاتا تھا، فتوے انہیں سے پوچھے جاتے تھے جو قرآن حکیم کے عالم ہوتے تھے، اور اس کے ناسخ و منسوخ کو، محکم و متشابہ کو اور اس کی تمام دلالتوں کو پہچانتے تھے، خواہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست تعلیم پائی ہو یا بڑے بڑے صحابہ سے احکام سنے ہوں، اسی لئے انہیں ''قراء'' (قاری کی جمع) کہا جاتا تھا، یعنی جو قرآن پڑھتے پڑھاتے ہیں،

کیونکہ عرب جاہل قوم تھی، اس لئے جو قرآن حکیم پڑھنے پڑھانے پر قادر ہو جاتا تھا اُسے خاص طور سے ''قاری'' کہہ دیا کرتے تھے، کیونکہ اس زمانہ میں پڑھے لکھے شاذ و نادر ہی ہوا کرتے تھے۔

آغازِ اسلام تک لوگوں کا یہی حال رہا، پھر اسلامی شہر عظیم بن گئے اور قرآن میں مشغول رہنے کی وجہ سے عرب سے جہالت ختم ہونے لگی اور لوگ دھڑا دھڑ استنباط کرنے لگے، اسی طرح استنباط کی جڑیں جم گئیں اور فقہ مکمل ہو کر ایک صنعت اور مکمل علم بن گیا، اب یہ لوگ بجائے ''قراء'' کے ''فقہاء'' اور ''علماء'' کہلائے جانے لگے۔''

(مقدمہ ابن خلدون مترجم ج:۲ ص:۳۴۱ فصل:۷)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ فقہاء کا استنباط کوئی نئی چیز نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے ہی یہ چلا آرہا ہے، وہ الگ بات ہے کہ کوئی کوشش کے باوجود استنباط پر قادر نہ ہوا ہو، ورنہ نفسِ استنباط پر امت کے اقل قلیل کو چھوڑ کر باقی سب کا اتفاق ہے، حتیٰ کہ حفاظ اور محدثین نے بھی استنباطات کئے ہیں، بخاری کے تراجم اس کی واضح دلیل ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سمعت محمد بن اسماعیل یقول: قال بعض اهل الحديث فقه هذا الحديث ان القراءة على العالم والعرض عليه جائز مثل السماع واحتج بان الاعرابى عرض على النبى صلى الله عليه وسلم فاقر به النبى صلى الله عليه وسلم.'' (ابواب الزکوٰۃ دوسرا باب جامع ترمذی)

یعنی میں نے امام بخاریؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اس حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ طالب علم کا پڑھنا اور استاذ کا سننا جائز ہے، جیسے کہ استاذ کا عبارت پڑھنا بھی جائز ہے، دیکھئے قرآن کی کسی آیت یا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد میں یہ تصریح نہیں ملتی ہے کہ عبارت کون پڑھے گا؟ استاذ یا شاگرد؟ مگر

اعرابی کے پوچھنے اور حضور علیہ السلام کے اقرار کرنے سے فقہاء نے یہ حکم اخذ کیا کہ شاگرد بھی عبارت پڑھ سکتا ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے کہ دنیا کا کوئی شخص اس کا منکر نہیں حتیٰ کہ ظاہریہ بھی اس کو جائز سمجھتے ہیں، اگرچہ افضلیت میں اختلاف ہے۔

حجیتِ قیاس پر قرآن و حدیث اور اجماع سے دلائل

آیات مبارکہ:

ا:......"فاعتبروا یا اولی الابصار." (الحشر:۲)

ترجمہ:......"سو اے دانشمندو! (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو۔"

اس آیت سے حنفی مفسرین جیسے مدارک وغیرہ اور دیگر فقہاء تو قیاس کے حجت ہونے پر استدلال کرتے ہیں ہی مگر ان کے علاوہ بہت سے مفسرین بھی اس قسم کی آیات سے نہ صرف جواز قیاس پر بلکہ وجوب پر استدلال کرتے ہیں، چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اعلم انا قد تمسکنا بهذه الآیة فی کتاب المحصول من اصول الفقه علی ان القیاس حجة فلا نذکره هٰهنا."

(التفسیر الکبیر ج:۲۹ ص:۲۸۱ مطبع دار احیاء التراث العربی)

ترجمہ:......"جان لو کہ چونکہ ہم نے اصولِ فقہ کی کتاب "المحصول" میں اس آیت سے پختہ استدلال کیا ہے کہ قیاس حجت اور دلیل ہے، اس لئے یہاں اس کا اعادہ نہیں کرتے

ہیں۔“

پھر آگے مزید لکھتے ہیں (المسألة الثانية) کہ ”اعتبار“، ”عبور“ سے بنا ہے، جو ایک شے سے دوسری شے کی طرف منتقل ہونے کو کہتے ہیں۔ ”آنسو“ کو بھی ”عَبرة“ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے رخساروں پر منتقل ہوجاتے ہیں۔ خواب کے مطلب بتانے والے کو ”معبّر“ اور اس علم کو ”تعبیر“ بھی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں خیالی چیز (خواب) سے ایک معقول معنی کی طرف انتقال ہوتا ہے۔ الفاظ کو ”عبارات“ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ان الفاظ کی وساطت سے ایک آدمی کے ذہن سے معانی دوسرے آدمی کے ذہن میں منتقل ہوجاتے ہیں، اس لئے کہا جاتا ہے: ”السعید من اعتبر بغیرہ“ (نیک بخت اور خوش قسمت وہ ہوتا ہے جو دوسرے سے عبرت حاصل کرے) کیونکہ اس شخص کی عقل دوسرے آدمی کی حالت سے نتیجہ اخذ کرکے اپنے (صاحبِ عقل کے) اوپر منطبق کرتی ہے۔

”ولهٰذا قال المفسرون: الاعتبار هو النظر فی حقائق الاشياء وجهات دلالتها لِيُعرف بالنظر فيها شیٔ آخر من جنسها.“ (ایضاً ج:٢٩ ص:٢٨٢)

ترجمہ:...... ”اور اسی بناء پر مفسرین نے کہا ہے کہ: اعتبار اشیاء کی ماہیتوں اور ان کی دلالتوں کے طور وطریقوں میں غور کرنے (تاکہ اس سے اسی طرح کی دیگر اشیاء کا حکم معلوم ہوسکے) کو کہتے ہیں۔“

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”واستدل به علیٰ ان القياس حجة من حيث أنهٗ أمر بالمجاوزة من حال الیٰ حال وحملها عليها فی حكم لمّا بينهما من المشاركة المقتضية له علیٰ ما

قررناہٗ فی الکتب الاصولیۃ.“

(تفسیر بیضاوی ج:۵ ص:۳۱۷، مطبع دارالفکر)

ترجمہ:......”اس سے قیاس کے دلیل ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ اس آیت میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے اور ایک حال کو دوسرے حال پر محمول کرنے اور دونوں کو ایسے حکم میں ملانے کا حکم دیا ہے جس میں دونوں شریک ہوں، اور یہی علت اس ملانے (یعنی قیاس کرنے) کو مقتضی ہے، جیسا کہ ہم نے اصول کی کتب میں ثابت کردیا ہے۔“

۲:......”ما قطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علیٰ اُصولھا فباذن اللہ.“ (الحشر:۵)

ترجمہ:......”جو کھجوروں کے درخت کے تنے تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو (دونوں باتیں) خدا ہی کے حکم (اور رضا) کے موافق ہے۔“

اس آیت کا سبب نزول ہی قیاس بنا جیسے کہ مفسرین اور مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بنونضیر کے درخت کاٹنے لگے تو انہوں نے اعتراض کیا: اے محمد! ہم تو غدار اور بدعہد ہیں، اس لئے آپ ہمارے قتل کے درپے ہیں، مگر ان کھیتوں اور باغوں نے کیا قصور کیا ہے جس کی پاداش میں ان کے سر قلم ہو رہے ہیں؟ چونکہ یہ پیغام بادی النظر میں معقولیت کا پہلو لئے ہوئے تھا، اس لئے صحابہ میں اختلافِ رائے پیدا ہوا، بعض نے کہا کہ شاید یہ عمل فساد میں آئے، اس لئے نہیں کاٹنا چاہئے، جبکہ بعض ان کو غصہ دلانے کے لئے کاٹنے پر مصر تھے، اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی جس میں دونوں کاموں سے رفع حرج کا بیان ہے۔ اگر شریعت میں رائے کی

کوئی حیثیت واقعی نہ ہوتی جیسے کہ ظاہریہ کہتے ہیں تو یہاں ضرور اس کی نفی ہوجانی چاہئے تھی۔

۳:......"فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعملون." (النحل:۴۳)

ترجمہ:......"تو اگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھو۔"

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ منکرین اس آیت کے ظاہر سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ اگر قیاس واجب ہوگا تو اس آیت میں پوچھنے کا حکم نہ دیا جاتا، گویا قیاس کرنا اس آیت کے ظاہر کے منافی ہے:

"وجوابہ: انہ ثبت جواز العمل بالقیاس باجماع الصحابۃ والاجماع اقویٰ من ھذا الدلیل."

(تفسیر کبیر جز:۲۰ ص:۳۷)

ترجمہ:......"اس (استدلال) کا جواب یہ ہے کہ قیاس پر عمل کرنا تو صحابہ کرام کے اجماع سے ثابت ہے اور اجماع اس دلیل سے زیادہ مضبوط و مستحکم دلیل ہے۔"

نیز ان کا یہ استدلال اس لئے بھی باطل ہے کہ یہ خود پوچھنے کا اقرار کرتے ہیں، تو جس سے پوچھا جائے اور اس کے پاس نص نہ ہو، مثلاً: روزہ کی حالت میں انجکشن لگانے سے روزہ ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ مریض کو خون دینا جائز ہے یا نہیں؟ نابینا کی گواہی جائز ہے یا نہیں؟ گاڑی پر نماز ہوتی ہے یا نہیں؟ بھینس کا دودھ پاک اور حلال ہے یا نہیں؟ جہاں چھ ماہ دن ہو وہاں کتنی نمازیں دن بھر میں ادا کی جائیں گی؟ کیا چھ ماہ تک مسلسل ایک ہی روزہ جاری رکھا جائے گا؟ وغیرہ، وغیرہ۔

تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے گا؟ اور کیسے جواب دے گا؟

اس آیت کی تفسیر میں امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وفی الآیة دلیل علیٰ وجوب المراجعة الی العلماء فیما لا یعلم."

(تفسیر بیضاوی ج:۳ ص:۳۹۹، مکتبۃ دارالفکر)

یعنی اس آیت میں اس کی دلیل ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اس میں علماء سے رجوع کرنا واجب ہے۔

۴:......"واذا جاء هم امر من الامن او الخوف اذاعوا به ولو ردوه الی الرسول والی اولی الامر منهم لعلمه الذین یستنبطونه منهم." (النساء:۸۳)

ترجمہ:......"اور جب ان لوگوں کو کسی امر کی خبر پہنچتی ہے خواہ امن ہو یا خوف تو اس کو مشہور کردیتے ہیں، اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے ہیں۔"

تفسیر کشاف میں ہے:

"والنبط: الماء یخرج من البئر اول ما تحفر وانباطه واستنباطه: اخراجه واستخراجه فاستعیر لما یستخرجه الرجل بفضل ذهنه من المعانی والتدابیر فیما یعضل ویهم."

(تفسیر کشاف ج:۱ ص:۵۴۱، مظہری کتب خانہ)

ترجمہ:......"نبط لغت میں اس پانی کو کہتے ہیں جو کنواں کھودتے وقت پہلی بار نکلے (اس سے لفظ) انباط اور استنباط کے معنی بآسانی یا بہ دقت نکالنے کے ہیں، پھر یہ لفظ

(استنباط) ان معانی اور تدبیروں کے لئے استعمال کیا گیا جن کو آدمی مشکل اور پیچیدہ صورتوں میں اپنے تیز فہم سے نکالتا ہے۔''

تفسیر کبیر میں ہے:

''(المسألة الرابعة) دلت هذه الآية علىٰ ان القياس حجة فى الشرع.''

ترجمہ:......''(چوتھا مسئلہ) یہ آیت اس بات کی دلیل ہوئی کہ قیاس شرع میں دلیل ہے۔''

پھر اس کی دلیل بیان کرنے کے بعد مزید تحریر فرماتے ہیں:

''فثبت ان الله امر المكلف برد الواقعة الىٰ من يستنبط الحكم فيها ولو لا ان الاستنباط حجة لما امر المكلف بذالک، فثبت ان الاستنباط حجة، والقياس اما استنباط او داخل فيه، فوجب ان يكون حجة واذا ثبت هذا فنقول: الآية دالة علىٰ امور احدها ان فى احكام الحوادث ما لا يعرف بالنص بل بالاستنباط.

وثانيها: ان الاستنباط حجة.

وثالثها: ان العامى يجب عليه تقليد العلماء فى احكام الحوادث.

ورابعها: ان النبى صلى الله عليه وسلم كان مكلفاً باستنباط الاحكام لانه تعالىٰ أمر بالرد الى الرسول والىٰ اولى الامر.'' (جز:۱۰ ص:۲۰۰)

ترجمہ:......''ثابت ہوا کہ اللہ نے مکلّف کو حکم دیا ہے کہ وہ واقعہ (مسئلہ) اس شخص کی طرف سے لوٹائے یعنی پیش

کرے جو اس کا حکم نکال سکتا ہو، اگر استنباط دلیل نہ ہوتا تو اللہ مکلّف کو اس کا حکم نہ دیتا (کیونکہ اللہ فضول چیز کا حکم نہیں دیتا ہے) تو ثابت ہوا کہ استنباط دلیل ہے، اور قیاس یا تو (عین) استنباط ہے یا اس میں (بطور جزء) داخل ہے، پس ضروری ہوا کہ قیاس بھی دلیل ہو (یعنی دونوں صورتوں میں خواہ قیاس ہو بہو استنباط مانا جائے یا اس کا جزء، اور دونوں صورتوں میں استنباط ملزوم ہوا، جیسے انسان کا ثبوت ناطق وحیوان کو مستلزم ہے) اور جب یہ بات طے ہوئی تو اب ہم کہتے ہیں کہ یہ آیت چند باتوں پر دال ہے:

ایک یہ کہ رونما ہونے والے نئے واقعات میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا حکم نص سے معلوم نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ استنباط کے ذریعہ (جیسے جہاز میں نماز کا مسئلہ مثلاً)۔

دوسرے یہ کہ استنباط (قوی) دلیل ہے۔

تیسرے یہ کہ عام آدمی پر لازم ہے کہ وہ نئے پیش آنے والے واقعات میں علماء کی تقلید کرے۔

چوتھے یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی احکام کے استخراج کے مکلّف تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اور اولی الامر کی طرف لوٹانے اور لے جانے کا حکم دیا ہے (اور پھر آپؐ پر بحیثیت رسول فیصلہ لازم ہو جاتا)۔"

تفسیر منیر میں ہے:

"والمراد هنا: ما يستخرجه الرجل العالم بفضل عقله وعلمه من الافكار والاحكام وحلول

القضایا۔" (ج:۵ ص:۱۷۴)

ترجمہ:......"یہاں پر اس آیت سے مراد وہ افکار، احکام اور فیصلے ہیں جن کو صاحبِ علم آدمی اپنی کامل عقل اور کامل علم کے ذریعے نکالتا ہے۔"

تفسیر خازن میں ہے:

"وفی الآیة دلیل علیٰ جواز القیاس، وان من العلم ما یدرک بالنص وهو الکتاب والسنة، ومنه ما یدرک بالاستنباط وهو القیاس علیهما۔"

(ج:۱ ص:۳۸۳، مطبع دارالمعرفۃ بیروت)

ترجمہ:......"اس آیت میں قیاس کے جواز کی دلیل موجود ہے اور یہ کہ علم ایک وہ ہے جو نص یعنی قرآن و حدیث سے معلوم ہوسکے اور دوسرا وہ ہے جو استنباط سے معلوم کیا جاسکے (یعنی) وہ ان دونوں پر قیاس (کا نام) ہے۔"

۵:......"یا ایها الذین امنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔" (النساء:۵۹)

ترجمہ:......"اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو اور تم میں سے اختیار والوں کا۔"

اس کی تفسیر خازن میں اس طرح آئی ہے:

"قال ابن عباس وجابر هم الفقهاء والعلماء الذین یعلّمون الناس معالم دینهم وهو قول الحسن والضحاک ومجاهد۔" (ج:۱ ص:۳۷۲)

ترجمہ:......"حضرت ابن عباس وحضرت جابر رضی اللہ

عنہما نے فرمایا کہ: اولی الامر سے مراد فقہاء اور وہ علماء ہیں جو لوگوں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں، یہی قول حسن بصری، ضحاک اور حضرت مجاہد کا بھی ہے۔"

امام رازی رحمہ اللہ نے پُرزور انداز میں استدلال کر کے اس آیت کو اصولِ اربعہ یعنی چاروں اصول: قرآن و سنت، اجماع اور قیاس کی دلیل بنایا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"(المسألة الثانية) اعلم ان هذه الآية، آية شريفة مشتملة علىٰ اكثر علم اصول الفقه وذالك لان الفقهاء زعموا ان اصول الشريعة اربع: الكتاب والسنة والاجماع والقياس، وهذه الآية مشتملة علىٰ تقرير هذه الاصول الاربعة بهذا الترتيب اما الكتاب والسنة فقد وقعت الاشارة اليهما بقوله: اطيعوا الله واطيعوا الرسول."

ترجمہ:..... "جان لو کہ یہ آیت بہت بلند رتبہ آیت ہے، اصول فقہ کے اکثر علم پر مشتمل ہے، بایں معنی کہ فقہاء کے مطابق اصولِ شریعت چار ہیں: قرآن، حدیث و اجماع اور قیاس، اور یہ آیت ان چاروں اصول کے اثبات پر اسی ترتیب کے ساتھ مشتمل ہے۔ قرآن و سنت دونوں کی طرف تو اس ارشاد میں اشارہ ہوا ہے کہ: اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول۔"

پھر آگے مزید لکھتے ہیں: "(المسألة الثالثة) اعلم ان قوله: "واولی الامر منكم" يدل علىٰ ان اجماع الامة حجة."

(یعنی اولی الامر سے مراد اجماعِ امت ہے) اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے

ہمیں ''اولی الامر'' کی اطاعت کرنے کا اٹل حکم دیا ہے، پس اگر اس سے مراد حکام لئے جائیں (جیسے کہ بعض کہتے ہیں) تو ان کی اطاعت تو تب لازم ہوگی جب وہ معصوم ہوں، یعنی خطاء وغلطی سے پاک ہوں، اور انفرادی طور پر تو نبی کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہے، پھر ان کی اطاعت کو لازم کرنے کا کیا مطلب ہوا؟

ہاں! چونکہ امت من حیث المجموع معصوم ہے، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ساری امت خطاء اور ضلالت پر اجماع کرے.....لہٰذا یہی مراد ہے..... نیز: ''وعندنا ان طاعة اهل الاجماع واجبة قطعاً واما طاعة الامراء والسلاطين فغير واجبة قطعاً بل الاكثر انها تكون محرمة لانهم لا يأمرون الا بالظلم ...... فكان حمل الآية على الاجماع اولىٰ ......''۔

(دوسری بات یہ ہے کہ) ہمارے نزدیک اہل اجماع کی فرمانبرداری تو بہرحال لازم ہے، جبکہ امراء اور بادشاہوں کی تابعداری ہر حالت میں ضروری نہیں ہے، بلکہ بسااوقات تو وہ حرام ہوتی ہے، کیونکہ وہ سوائے ظلم کے کسی چیز کا حکم نہیں دیتے ہیں......لہٰذا اس آیت (اولی الامر) کو اجماع پر فٹ کرنا زیادہ بہتر ہے، (تاکہ مراد ایسی اطاعت ہو جو ہر حال میں لازمی ہو اور اس آیت پر عمل ہو سکے اور وہ فقط اجماع کی صورت میں ہی ممکن ہے، نہ کہ حکام کی شکل میں کیونکہ آج کل کون سا حاکم عدل اور انصاف کی بات کرتا ہے؟ کیا سارے امریکہ کے ظلم و جور اور موجودہ بربریت اور مجاہدین کو دہشت گرد کہنے اور ان کے درپے ہلاکت میں شریک کار نہیں ہیں؟

(تیسری بات یہ ہے کہ)''ان اعمال الأمراء والسلاطين موقوفة علىٰ فتاوى العلماء، والعلماء فى الحقيقة أمراء الأمراء فكان حمل لفظ ''اولى الامر'' عليهم أولىٰ.'' یعنی حکمرانوں اور سلاطین کے اعمال تو علماء کے فتویٰ پر موقوف ہیں، (مطلب یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال قابل اور واجب اطاعت ہیں جن کی علمائے وقت اجازت دے دیں) تو درحقیقت علماء، امراء کے امراء ہوتے (یعنی

حکام کی اطاعت چونکہ علماء کی وجہ سے لازم ہوجاتی ہے، تو ان کی اطاعت بالواسطہ درحقیقت اور مآلاً علماء ہی کی اطاعت ہوئی) لہٰذا اسے براہِ راست علماء کی اطاعت پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، (یہاں تک اس آیت سے تین اصول ثابت ہوئے، چوتھے اصول یعنی قیاس کا اثبات اس آیت کے اگلے حصے سے ہوتا ہے)۔

"(المسألة الرابعة) اعلم ان قوله: فان تنازعتم فی شیء فردوه الی الله والرسول." پھر اگر جھگڑ پڑو کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے۔ (النساء:۵۹) "یدل عندنا علیٰ ان القیاس حجة." آیت کا یہ اگلا حصہ قیاس کے حجت ہونے پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ اس میں حکم ہوا کہ جس چیز میں اختلاف ہو اسے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو، تو جس مسئلہ میں اختلاف ہوا اگر اس کے متعلق نص موجود ہو تو پھر اس حصہٗ آیت کا کچھ مطلب نہیں بنے گا کیونکہ منصوص کے متعلق حکم تو آیت کے سابقہ حصہ میں بیان ہوا پھر تو ایک ہی آیت میں بلا فائدہ تکرار ہوجائے گا جو کہ جائز نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ مراد غیر منصوص چیز میں اختلاف ہے۔ "واذا کان کذالک لم یکن المراد من قوله (فردوه الی الله والرسول) طلب حکمه من نصوص الکتاب والسنة، فوجب ان یکون المراد، ردّ حکمه الی الاحکام المنصوصة فی الوقائع المتشابهة له وذالک هو القیاس، فثبت ان الآیة دالة علی الامر بالقیاس." اور جب ایسا ہی ہے یعنی مراد غیر منصوص ہے تو اس ارشاد: "فردوه الی الله والوسول" کا مطلب یہ نہیں ہوا کہ اس (اختلافی مسئلہ) کا حکم قرآن و حدیث سے معلوم کرو، تو لامحالہ پھر مطلب یہی ہوا کہ اس کا حکم ان منصوص احکام سے معلوم کرلیا کرو جو اس جیسے واقعات کے بارے میں نازل ہوئے ہیں اور یہی چیز "قیاس" کہلاتی ہے، تو ثابت ہوا کہ یہ آیت قیاس کرنے کے حکم پر دال و ناطق ہے۔ (خلاصۂ بحث از ۱۴۳ تا ۱۴۶ جز:۱۰)

۶:......قرآن حکیم میں جا بجا و بارہا اہل عقل کو مخاطب کیا گیا ہے اور عقل

سے کام لینے کے لئے کہا گیا ہے، اگر رائے کی کوئی بھی حیثیت عندالشرع نہ ہوتو اولاً تو اس نام سے خطاب میں کوئی فائدہ نہیں رہے گا، کیونکہ مسلّمہ قاعدہ ہے کہ مشتق پر حکم ماخذ الاشتقاق کی علت ہونے پر لگایا جاتا ہے، دوسرے یہ ماننا پڑے گا کہ عقل کی تخلیق کا فائدہ صرف دنیوی مقاصد کے دائرہ میں منحصر ہے، شرع میں اس کا کوئی فائدہ نہیں یا پھر زیادہ سے زیادہ صریح احکام کے علاوہ وہ تضمنی اور التزامی دلالات اور اشارات وغیرہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ ایسی بات ہے کہ اس سے بہت سارے احکام کو معطل ماننا پڑے گا، نیز اس قول کے مطابق پھر قرآن کو کیسے معجز کہا جائے گا؟

ارشاداتِ نبویہ ﷺ سے قیاس کا ثبوت

احادیثِ مبارکہ میں غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نئے واقعات کے رونما ہونے پر نص نہ ہونے کی صورت میں قیاس فرمایا کرتے اور کسی کی طرف سے اس پر اعتراض نہیں ہوتا تھا، اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو ان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ قیاس پر عمل پیرا تھے اور اس کی ایک نہیں بلکہ متعدد مثالیں موجود ہیں، ان میں سے چند پیش کئے جاتے ہیں۔

۱:...... بخاری وغیرہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ (دستہ) روانہ فرمایا اور ان پر انصار میں سے ایک آدمی (عبداللہ بن حذافہ السہمی) امیر مقرر فرمایا، اور ان لوگوں کو ان (امیر) کی اطاعت کرنے کا حکم فرمایا، چنانچہ (کسی وجہ سے) وہ ان پر غصہ ہوئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میری فرمانبرداری کرنے کا حکم نہیں دیا ہے؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! پھر انہوں نے کہا: لکڑیاں جمع کردو۔ تو انہوں نے جمع کردیں، پھر

کہا: آگ جلا دو! (تعمیل حکم کرتے ہوئے) انہوں نے ان لکڑیوں کو آگ لگا دی، پھر کہا: اب اس آگ میں داخل ہوجاؤ! تو (پہلے) انہوں نے اس میں داخل ہونے کا ارادہ کیا، اور (پھر) ایک دوسرے کو دیکھنے لگے (ابن کثیر رحمہ اللہ نے بعض طرق سے نقل کیا ہے کہ ایک نوجوان نے منع کردیا) اور ایک دوسرے کو روکتے ہوئے کہنے لگے کہ: ہم تو آگ سے بھاگ کر ہی حضور علیہ السلام کے پاس آئے ہیں پھر اس آگ میں کیوں داخل ہوں؟ وہ اسی طرح (پریشان حال کھڑے) رہے یہاں تک کہ آگ ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ان (امیر) کا غصہ بھی فرو ہوگیا، جب اس کی اطلاع نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوگئی تو فرمایا کہ: اگر یہ اس میں داخل ہوتے تو قیامت تک اس سے نہ نکلتے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: کبھی بھی اس سے نہ نکلتے۔

(صحیح بخاری باب سریۃ عبداللہ بن حذافہ ج:۲ ص:۶۲۲ و ج:۲ ص:۱۰۵۸)

دیکھئے! ان صحابہ کو امیر کا حکم ماننا لازم قرار دیا تھا، مگر انہوں نے آخرت کی آگ پر دنیاوی آگ کو قیاس کرکے نص میں تاویل کردی کہ اطاعت سے تو شاید مراد نیکیوں میں پیروی کرنا ہے، نہ کہ گناہ کی بات میں، کیونکہ جب آخرت کی آگ میں اپنے اختیار سے جانا جائز نہیں تو یہ بھی تو آگ ہی ہے، اس میں جانا اور چھلانگ لگانا کیوں مباح ہوسکتا ہے؟ اور یہ قیاس بمقابلہ نص بھی نہ تھا، کیونکہ حضور علیہ السلام نے اطلاع کے بعد ایسا ہی فرمایا: **"انما الطاعة فی المعروف"** کہ اطاعت تو نیکی کے کام میں ہوتی ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں بھی ایک خفی قیاس فرمایا ہے کہ آپؐ نے ان کے برعکس آخرت کی آگ کو دنیا کی آگ پر قیاس کیا ہے۔

۲:...... حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہم ایک سفر میں جارہے تھے کہ ہم میں سے ایک شخص کے پتھر لگا، جس نے اس کے سر کو زخمی کرڈالا، (اتفاق سے) اسے احتلام ہوا، چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ: کیا تمہارے

نزدیک (اس صورت میں) میرے لئے تیمم کرنا جائز ہے؟ انہوں نے کہا: ایسی صورت میں کہ جب تم پانی استعمال کرسکتے ہو ہم تمہارے لئے تیمم کی کوئی وجہ نہیں پاتے۔ چنانچہ اس شخص نے غسل کیا (جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ) اس کا انتقال ہوگیا۔ جب ہم (سفر سے واپس ہوکر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ سے یہ واقعہ بیان کیا، آپؐ نے (انتہائی رنج اور تکلیف کے ساتھ) فرمایا: لوگوں نے اسے مار دیا، خدا انہیں مارے! (پھر فرمایا کہ) اُن کو جو بات معلوم نہ تھی اسے انہوں نے دریافت کیوں نہ کرلیا؟ کیونکہ نادانی کی بیماری کا علاج سوال (میں) ہے، اور اسے تو یہی کافی تھا کہ تیمم کرلیتا اور (یا) اپنے زخم پر ایک پٹی باندھ کر اس پر مسح کرلیتا اور پھر اپنا تمام بدن دھولیتا۔ (مشکوٰۃ شریف ص:۵۵)

ان حضرات کا یہ جواب دینا اس آیت کے پیش نظر تھا: "فلم تجدوا ماء فتیمموا" (اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تیمم کرلو)۔ گویا تیمم صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جب پانی موجود نہ ہو، اور ظاہر نص کا صریح مطلب بھی یہی ہے، مگر پھر بھی حضور علیہ السلام نے فرمایا: "قَتَلُوهُ" ان لوگوں نے اسے مار دیا، کیونکہ اگر یہ خود نص سے مسئلہ مستنبط نہیں کرسکتے تھے تو غلط فتویٰ کے بجائے ان کو ایسے شخص سے پوچھنا چاہئے تھا جو صحیح مطلب جاننے اور حکم مستنبط کرنے پر قادر ہو، کیونکہ بطور اشارہ نص میں تیمم کرنے کی رخصت موجود ہے: "ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج." الآیہ، یعنی طہارت کا حکم تو پاک کرنے کے لئے ہے تمہیں تنگی اور مشکل میں ڈالنا مراد نہیں، لہٰذا جہاں پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو یا ضرر کا اندیشہ ہو اس صورت میں تیمم جائز ہوگا، گوکہ پانی موجود ہو۔ دیکھئے! یہ تصریح پہلے کبھی بھی کسی نص میں نہ تھی پھر بھی حضور علیہ السلام نے ان پر ناراضگی کا اظہار فرمایا تو اس کا مطلب غور و خوض کرنے یا ایسے غائر آدمی سے پوچھنے کی تعلیم کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ صحیح رائے کی تعلیم خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بنفس نفیس ثابت ہے، ہاں! جو آدمی خود نہیں جانتا وہ

اس حدیث کی تصریح کے مطابق عالم سے پوچھے۔

۳......"عن ابن عمر قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاحزاب: لا یُصلِّیَنَّ احدکم الّا فی بنی قریظة! فادرک بعضهم العصر فی الطریق، فقال بعضهم: لا نصلی حتیٰ نأتیها، وقال بعضهم: بل نصلِّی لم یُرد منا ذالک. فذکر ذالک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فلم یُعنِّف واحداً منهم."

(صحیح بخاری ج:۲ ص:۵۹۱ باب مرجع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الاحزاب ومخرجه الی ..... الخ)

ترجمہ:......"حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے احزاب (سے واپسی) والے دن فرمایا کہ: تم میں سے کوئی بھی بنوقریظہ کے علاوہ بھی عصر کی نماز نہ پڑھے! پس ان میں بعضوں کو عصر نے راستہ ہی میں پالیا تو ان میں سے بعض کہنے لگے کہ ہم تو بنوقریظہ پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے، جبکہ بعض نے کہا کہ: ہم تو پڑھ لیتے ہیں (یعنی پہنچنے سے پہلے) کیونکہ آپؐ کا مقصد یہ تو نہ تھا (کہ ہماری نماز ہی قضا ہوجائے)، تو انہوں نے (بعد میں) اس کا تذکرہ حضور علیہ السلام سے کیا، آپؐ نے کسی کو بھی نہیں ڈانٹا۔"

دیکھئے! حضور علیہ السلام نے بڑی تاکید کے ساتھ فرمادیا تھا کہ بنوقریظہ کے علاوہ کہیں بھی عصر نہ پڑھو، مگر پھر بھی بعض نے پڑھ لی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ اکثر وبیشتر تو مراد المتکلم ومراد الکلام باہم موافق ہوتی ہیں، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ کا مطلب بظاہر کچھ اور بنتا ہے حالانکہ متکلم (بولنے والے) کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے

جس کو قرائن سے پہچاننا پڑتا ہے، مثلاً: ایک آدمی کی دکان پر کوئی مشتبہ شخص آجائے، اور وہ اپنے خادم سے کہے کہ: ''میں نماز پڑھنے جارہا ہوں، تم اس شخص کا خیال رکھنا۔'' تو خادم یہی سمجھے گا کہ یہ مجھے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آدمی پر نظر رکھو کہیں چوری نہ کرلے، اس کے برعکس اگر وہ یہی جملہ اپنے دوست کے متعلق کہتا ہے تو خادم یہی سمجھتا ہے کہ یہ مجھے اس (دوست) کی خاطر مدارات وغیرہ کے بارے میں ہدایات دے رہا ہے۔

اسی لئے بعض صحابہؓ نے فرمایا کہ: آپؐ کا مقصد یہ نہ تھا کہ نماز قضا بھی ہوجائے تو ہونے دیں، بلکہ مطلب یہ تھا کہ جلدی جاؤ، اور ہم نماز پڑھ کر جلد ہی پہنچ جائیں گے، چونکہ یہ رائے صحیح تھی اس لئے آپؐ نے کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔

۴:...... پیچھے گزر چکا ہے کہ: ''**ما قطعتم من لينة او تركتموها قائمة على اصولها فباذن الله.**'' الآیہ، اس آیت کا سببِ نزول ہی اختلاف رائے ٹھہرا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ان کے درخت اور کھیتیاں کاٹ دو، تو صحابہؓ کاٹنے لگے، مگر بنونضر کے اعتراض پر پھر کچھ درخت چھوڑ دیئے گئے، بظاہر یہ نص کے خلاف ہے مگر اللہ نے فرمایا: ''**فباذن الله**'' یہ اللہ کے حکم کے موافق ہے۔ دیکھو! اس سے پہلے تو سوائے رائے کے اور کوئی حکم کھڑے چھوڑنے کا نہ تھا، بلکہ کاٹنے کا تھا، معلوم ہوا کہ صحیح رائے بھی اللہ کا حکم ہے، ہاں! رائے کی صحت کے لئے بڑے علم اور تدبر کی ضرورت ہے، ہر کس و ناکس کی رائے قابل التفات نہیں کہ عوام الناس بھی رائے زنی کرنے لگ جائیں، جو لوگ فی الواقع اصحاب الرائے ہیں تو شریعت میں ان کی بڑی منزلت ہے، اس لئے حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''**افضل العبادة، الرأى الحسن.**'' اچھی رائے عمدہ عبادت ہے۔

(تاویل مختلف الحدیث ص:۶۱، مطبع دار الفکر بیروت)

تنبیہ:...... اختصار کے پیش نظر مزید مثالوں سے گریز کیا گیا۔

اجماع سے قیاس و استنباط کا ثبوت

پیچھے گزر چکا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ نے قیاس کی حجیت پر اجماعِ صحابہ نقل فرمایا ہے، چنانچہ وہ ایک اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں:

”وجوابه انه ثبت جواز العمل بالقياس باجماع الصحابة والاجماع اقوىٰ من هذا الدليل.“

(التفسير الكبير جز:۲۰ ص:۳۷)

ترجمہ:......”اس (اعتراض) کا جواب یہ ہے کہ قیاس پر عمل کرنے کا جواز تو صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اجماع سے ثابت ہو چکا ہے جو اس دلیل سے زیادہ قوی ہے۔“

عبدالرحمٰن بن خلدون نے اس بارے میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہاں پیش ہے، وہ فرماتے ہیں:

”یاد رکھئے! ”اصولِ فقہ“ علومِ شرعیہ میں ایک عظیم اور جلیل الشان علم ہے، اور سب سے زیادہ مفید بھی ہے، شرعی دلائل میں اس حیثیت سے غور کرنا کہ ان سے احکام لئے جاسکیں ”اصولِ فقہ“ ہے۔

شرعی دلائل کے اصول میں سب سے بڑی اور اہم اصل، کتاب یعنی قرآن حکیم ہے، پھر سنتِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ) ہے، جس میں قرآن ہی کی وضاحت و تشریح ہے ...... پھر اجماع کو بمنزلہ کتاب و سنت قرار دیا گیا، کیونکہ صحابہ کرام بالاتفاق اجماع کے نہ ماننے والوں کو ڈانٹا کرتے تھے، ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ایسا بلا کسی دلیل کے نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ صحابہ جیسے مسلمان بلا کسی قطعی دلیل کے کسی مسئلے پر متفق نہیں ہو سکتے تھے اور جماعت کی عصمت دلائل سے ثابت ہے، اس لئے اجماع بھی دلائل شرعیہ میں شمار کرلیا گیا۔

جب ہم صحابہ کرام اور سلف کے کتاب وسنت سے استدلال کے طریقوں پر غور کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظائر اور امثال کا نظائر و امثال پر بھی قیاس کیا کرتے تھے۔

اس قیاس پر بھی ان کا اجماع تھا اور اسے سب تسلیم کیا کرتے تھے، کیونکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بہت سے ایسے واقعات پیش آئے جن کا ثبوت موجودہ نصوص سے نہیں ملتا تھا، اس لئے انہوں نے نصوصِ ثانیہ پر اس کا قیاس کیا اور انہیں (مقیس) انہیں (مقیس عیہ) میں شامل کرلیا، لیکن جزئیات کو کلیات سے ملانے کی چند شرطیں ہیں جو دونظیروں یا دومثلوں میں برابری کو صحیح قرار دیتی ہیں، قیاس میں ان شرطوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے تاکہ یہ گمان غالب ہوجائے کہ دونوں میں حق تعالیٰ کا ایک ہی حکم ہے، صحابہ کے اجماع سے یہ بھی ایک شرعی دلیل ہے اس کو قیاس کہتے ہیں جو چوتھے درجے پر ہے۔

جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ یہی شرعی دلائل کے اصول ہیں، اگرچہ بعض علماء نے اجماع وقیاس نہیں مانا، مگر ایسے علماء ناقابل التفات ہیں۔

(مقدمہ ابن خلدون مترجم ج:۲ ص:۳۴۹، مطبوعہ نفیس اکیڈمی)

اجماع کی مخالفت جائز نہیں:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"ومن يشاقق الرسول من بعد ما تبين له الهدى ويتبع غير سبيل المؤمنين نوله ما تولى ونصله جهنم وساءت مصيرا." (النساء:۱۱۵)

ترجمہ:...... "اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے رستہ کے

خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے اس کو دوزخ میں اور وہ بری جگہ پہنچا۔"

اکابر علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اجماعِ امت کا مخالف اور منکر جہنمی ہے، یعنی اجماعِ امت کو ماننا فرض ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ "ویتبع غیر سبیل المؤمنین" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"هذا ملازم للصفة الاولىٰ ولكن قد تكون المخالفة لِنصّ الشارع وقد تكون لِما اجتمعت عليه الامة المحمدية فيما علم اتفاقهم عليه تحقيقا، فانه ضمنت لهم العصمة فى اجتماعهم من الخطاء تشريفاً لهم وتعظيماً لنبيهم وقد وردت احاديث صحيحة كثيرة فى ذالک قد ذكرنا منها طرفا صالحاً فى كتاب احاديث الاصول ومن العلماء من ادعى تواتر معناها والذى عوّل عليه الشافعى رحمه الله فى الاحتجاج علىٰ كون الاجماع حجة تحرم مخالفته هذه الآية الكريمة بعد التروّى والفكر الطويل وهو من احسن الاستنباطات واقواها."

(تفسیر ابن کثیر ج:۱ ص:۵۵۵، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ)

ترجمہ:......"یہ مخالفت (مخالفتِ اجماع) اگرچہ پہلی مخالفت (مخالفتِ رسولؐ) کے ساتھ تو لازم تھی مگر مخالفت کبھی شارع کے مصرّح کلام کے خلاف کی صورت میں ہوتی ہے اور کبھی اس بات کی خلاف ورزی میں جس پر امتِ محمدیہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہو، بشرطیکہ ان کا اتفاق و اجماع ثابت ہو، کیونکہ ان

کی شرافت اور ان کے نبی کی تعظیم کی خاطر ان کے اجماع کی
خطاء سے پاک ہونے کی ضمانت دی گئی ہے، اور اس بارے میں
بہت سی صحیح احادیث وارد ہوچکی ہیں جن میں سے کچھ خاطر خواہ
حصہ ہم نے احادیث الاصول کی کتاب میں نقل کیا ہے، جبکہ
بعض علماء نے ان احادیث کے معنی کے تواتر کا دعویٰ کیا ہے، اور
جس پر امام شافعی رحمہ اللہ نے اجماع کی حجیت اور اس کی
مخالفت کے حرام ہونے کے استدلال میں اعتماد و بھروسہ کیا ہے
وہ یہی آیتِ کریمہ ہے، ایسا انہوں نے لمبی سوچ بچار کے بعد کیا
ہے، اور یہ ایک عمدہ اور مضبوط استنباط و استدلال ہے۔''

اس بیان کے بعد اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ قیاس کی مخالفت حرام ہے، کیونکہ قیاس کی حجیت پر اجماع ہے اور اجماع کی مخالفت حرام ہے تو حد اوسط ساقط کرنے اور اکبر کو اصغر کے ساتھ ملانے کے بعد لامحالہ یہ مطلب نکلتا ہے کہ قیاس کی مخالفت حرام ہے، بالفاظ دیگر قیاس کا ثبوت اجماع سے ہے (صغریٰ) اور اجماع دلیل قطعی ہے (کبریٰ) تو قیاس کا ثبوت دلیل قطعی سے ہے۔

(نتیجہ) اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ تمام اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ علم کا اطلاق پانچ اشیاء پر ہوتا ہے۔

۱:......ملکہ۔ ۲:......کل مسائل۔ ۳:......معتد بہا مسائل۔

۴:......کل تصدیقات۔ ۵:......معتد بہا تصدیقات۔

اس میں ما ھو المشہور کے مطابق علم کا اطلاق عموماً ملکہ پر ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسائل میں اتنی مہارت حاصل کرنا جس کی وجہ سے آدمی بآسانی کلیات سے جزئیات کی تخریج یعنی اصول سے مسائل جزئی کے نکالنے پر قادر ہو، لہٰذا جب علم کا مطلب و مفہوم یہی ہے تو بداہتہً عالم وہ شخص کہلائے گا جو مسائل اور

جزئیات کا استنباط کرسکتا ہو اور پہلے گزر چکا ہے کہ قیاس یا عین استنباط ہے یا اس میں داخل ہے، کما قالہ الرازی رحمہ اللہ۔

لہٰذا عالم کو استخراج سے روکنا اور اس کو قرآن وسنت کے فقط مصرّحات تک محدود رکھنا مقتضائے علم کے منافی ہے جس کا کوئی عاقل قائل نہیں ہوسکتا۔

فقہ اب فقط چاروں مذاہب تک محدود ہے

علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون فرماتے ہیں:

"پھر امام مالک کے بعد محمد بن ادریس مطلبی شافعیؒ (امام شافعی رحمہ اللہ) کا زمانہ ہے، آپ امام مالکؒ کے بعد عراق تشریف لے گئے اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں سے ملے اور ان سے فقہ سیکھا، آپ نے حجازیوں اور عراقیوں کے طریقے ملاکر اپنا ایک نیا مسلک بنایا اور بہت سے مسائل میں امام مالکؒ کی مخالفت کی۔

پھر امام احمد بن حنبلؒ افق دین پر چمکے، آپ بڑے محدثین میں سے تھے، آپ کے شاگردوں نے امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں سے فقہ پڑھا، حالانکہ ان کے پاس حدیث کا سرمایہ بہت تھا، آپ کے شاگرد ایک نئے مسلک کے ساتھ مخصوص ہوئے۔

اسلامی ممالک میں لوگوں نے انہیں چاروں اماموں کی تقلید پر قناعت کی اور دیگر اماموں کی تقلید کرنے والوں کا نام ونشان بھی نہ رہا (حالانکہ مذاہب کم از کم دس تھے، کما قالہ السیوطی)، لوگوں نے اختلافِ مسالک کا دروازہ بند کردیا، کیونکہ علوم کی اصطلاحوں کی کثرت ہوگئی اور اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کی لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی، اور اس لئے بھی کہ ہرکس وناکس مجتہد نہ بن بیٹھے۔

اس لئے صراحت سے کہہ دیا گیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں اور سب تقلید کے لئے مجبور ہیں۔ ان چاروں اماموں میں سے جس کی چاہیں تقلید

کریں، یہ حرام ہے کہ چاروں کی باری باری تقلید کریں، کیونکہ اس طرح تو دین مذاق بن کر رہ جائے گا۔

اب فقہ میں چاروں اماموں کے اقوال بیان کئے جاتے ہیں، اور ہر مقلد اپنے امام کے قول پر عمل کرتا ہے، جبکہ اصول کی تشریح اور روایت کی سند کا بھی اچھی طرح سے پیش نظر رکھنا ہے، آج ''فقہ'' کا بس اتنا ہی مفہوم ہے، اگر آج کوئی مجتہد بن بیٹھے تو اس کے اجتہاد کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور نہ اس کی تقلید پر کوئی آمادہ ہوگا۔

آج دنیا کے تمام مسلمان انہیں چاروں کی تقلید کی طرف لوٹ گئے ہیں۔

(مقدمہ ج:۲ ص:۴۴۳)

ائمہ اربعہ میں سب سے زیادہ پیروکار امام ابوحنیفہؒ پھر امام شافعیؒ کے ہیں:

وہ مزید لکھتے ہیں کہ: امام احمد کے ماننے والے تھوڑے ہیں کیونکہ ان کے مذہب میں اجتہاد بہت کم ہے اور زیادہ تر اخبار و روایات پر مبنی ہے، ان کے ماننے والے اکثر شام و عراق کے علاقے بغداد اور اس کے نواح میں پائے جاتے ہیں، یہ سب سے زیادہ احادیث و روایات کے حافظ ہوتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے ماننے والے آج عراقی، سندھی، چینی، ماوراء النہری اور تمام عجمی شہروں (جیسے ہندوستان، بنگلہ دیش اور برما وغیرہ) کے مسلمان ہیں، کیونکہ ان کا مذہب خصوصیت سے عراق اور دارالسلام کا مذہب تھا، جو سرکاری مذہب تھا (جیسے آج کل حنبلی مذہب ہے سعودیہ وغیرہ میں) اور سرکاری مذہب ہی کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے، پھر آپ کے شاگردوں کو خلفائے عباسیہ کی صحبت بھی حاصل تھی اس لئے ان کے فقہ پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں اور شافعیوں سے مناظرہ کی مجلسیں بھی خوب گرم رہیں، اور اختلافی مسائل میں انتہائی نفیس و مفید مذاکرے ہوئے، اور انہوں نے

گہرے اور سنجیدہ نظریات پیش کئے، اور عجیب وغریب خیالات کا اظہار کیا، ان کے کارنامے لوگوں کے سامنے ہیں جو تھوڑے سے مغرب میں بھی پائے جاتے ہیں، انہیں نقل کر کے مغرب میں لانے والے قاضی ابن عربی اور ابوالولید باجی ہیں۔

امام شافعیؒ کے ماننے والے زیادہ تر مصر میں ہیں، ان کا مذہب عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں بھی پھیل گیا ہے، شافعی اسلامی شہروں میں درس وتدریس میں اور فتاویٰ نویسی میں حنفیوں کے دوش بدوش نظر آتے ہیں، ان میں مناظروں کی بڑی بڑی مجلسیں منعقد ہوتی رہیں، اختلافی مسائل کی کتابیں ان کے وضع وضع کے دلائل سے بھری پڑی ہیں، پھر یہ پُر رونق علمی مجلسیں نذرِ عدم ہوگئیں۔

امام مالکؒ کے ماننے والے خاص طور سے مغرب و اندلس میں ہیں کیونکہ اندلسی اکثر حجاز میں آتے جاتے رہے، حجاز ہی تک ان کا سفر رہتا تھا، اس زمانے میں مدینہ ہی دار العلم تھا اور مدینہ ہی سے علم عراق پہنچا تھا، عراق اہل مغرب کے راستے میں نہیں پڑتا تھا (ورنہ شاید یہاں سے وہ حنفی مذہب ہی لے جاتے) اس لئے انہوں نے علمائے مدینہ ہی سے علم سیکھنے پر قناعت کی، اس زمانے میں مدینہ کے شیخ وامام، امام مالکؒ تھے اور آپ سے پہلے آپ کے اساتذہ تھے اور آپ کے بعد آپ کے شاگرد تھے، مغرب والے (تیونس ومراکش اور الجزائر وغیرہ) انہی کے پاس آتے جاتے رہے اور انہی سے استفادہ کرتے رہے، لہٰذا دوسروں کو چھوڑ کر انہی کے معتقد بن گئے، علاوہ ازیں اہل مغرب واندلس پر بدویت غالب تھی اور وہ عراقیوں کی طرح شہری تمدن سے نا آشنا تھے، اس لئے یہ اس مناسبت کی وجہ سے بھی حجازیوں کی طرف زیادہ مائل رہے تھے، کیونکہ حجازیوں پر بھی بدویت غالب تھی، اس لئے ان پر ہمیشہ مالکی مذہب تروتازہ وشاداب رہا، اور اس پر شہریت کی تہذیب کا اثر نہیں پڑا جیسا کہ دوسرے مذاہب پر پڑا۔" (مقدمہ ابن خلدون ج:۲ ص:۳۴۴، ۳۴۵)

وہ ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''عراقیوں کے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت ہیں، آپ فقہ میں انتہائی بلند پایہ امام ہیں، آپ کا مقام کوئی نہ پاسکا، حتیٰ کہ آپ کے ہم مشربوں نے خصوصاً امام مالک وشافعی نے بھی فقہ میں آپ کے بلند مرتبہ کا اعتراف کیا ہے۔'' (ج:۲ ص:۴۴۲)

غیر مقلدین کی کتابیں پڑھنے والا وقت ضائع کرتا ہے

واضح رہے کہ جو لوگ فقہ اور قیاس کے خلاف ہیں انہیں آج کل کی اصطلاح میں ''غیر مقلد'' کہتے ہیں، جبکہ وہ خود کو ''اہل حدیث'' کے نام سے موسوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو متقدمین اور علماء کی اصطلاح اور عرف میں ''ظاہریہ'' یا ''اہل الظواہر'' کہا جاتا ہے، ''ظاہریہ'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ظاہرِ حدیث پر چلتے ہیں، اگر کوئی حدیث سند کے لحاظ سے صحیح ہے یا آج کل کے غیر مقلدین کے زعم میں وہ بخاری و مسلم میں مروی ہو تو اس کا لفظی مطلب مراد لیتے ہیں، خواہ وہ شارع علیہ السلام کی مراد ہو یا نہ ہو، مثلاً: اگر کسی کی ہوا خارج ہوئی مگر اس نے آواز نہیں سنی یا بدبو کا احساس نہیں کیا، تو اس کا وضو برقرار ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ جب تک آواز نہ سنے یا بدبو نہ پائے اس وقت تک مسجد سے نہ نکلے۔ دیکھئے! اس کا ظاہر مطلب تو یہی ہے کہ ان دو شرطوں کے بغیر وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن حضور علیہ السلام کا مطلب یہ ہرگز نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ شک کے درپے نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے وسوسہ اور مالیخولیا کی بیماری بڑھتی ہے، بلکہ یقین پر چلنا چاہئے، لہٰذا جب وضو کا پہلے سے یقین تھا تو اب بغیر احساسِ ہوا کے پریشان نہ ہونا چاہئے، حتیٰ کہ اگر آدمی کو زکام یا تیز ہوا چلنے یا شور کی وجہ سے بدبو سونگھنے اور آواز سننے کا علم تو نہ ہوسکا، مگر اسے خروج کا یقین ہوگیا تو فقہاء کے نزدیک اس کا وضو ٹوٹ گیا، اور یہ بات بغیر کسی زیادہ غور وفکر کے سمجھ میں آتی ہے، علیٰ ہذا القیاس!

ایسے لوگوں کے متعلق ابن خلدون کا تبصرہ پیشِ نظر رہے:

”آج ظاہریہ کا مذہب بھی مٹ مٹا گیا ہے، کیونکہ اس کے امام ختم ہو گئے اور جو یہ مذہب اختیار کر لیتا ہے اس پر جمہور کی طرف سے لعن طعن پڑتی ہے، اب یہ مذہب محض کتابوں میں ہے، کہیں اور نہیں، بہت سے طلبہ جو ان کے مذاہب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کتابوں سے ان کا فقہ اور مذہب سیکھنا چاہتے ہیں وہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، اور اس سے جمہور کی مخالفت اور ان کے مذہب سے انکار بھی لازم آتا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس مذہب کی وجہ سے بدعتیوں میں شمار کر لئے جائیں کیونکہ وہ اساتذہ کی چابی کے بغیر کتابوں سے علم کو نقل کر رہے ہیں۔

ابن حزم نے ایسا ہی کیا تھا، حالانکہ حفظِ حدیث میں ان کا بہت اونچا مقام تھا، یہ ظاہریہ مذہب کی طرف لوٹ گئے اور اس میں ایسے ہوشیار و ماہر ہو گئے کہ اپنے زعم میں ان کے اقوال نے اجتہادی درجہ حاصل کر لیا اور امام داؤد (ظاہری) کی مخالفت بھی کی اور بہت سے مسلمان اماموں پر بھی لے دے کی، علماء کو ان کا رویہ برا معلوم ہوا اور انہوں نے اس مذہب کی پوری تفصیل سے تردید کی اور برائی بیان کی، اور ان کی کتابوں سے بائیکاٹ کیا اور بازاروں میں ان کی خرید وفروخت پر پابندی لگا دی، بلکہ کبھی کبھی تو انہیں پھاڑ بھی دیا جاتا تھا۔“ (مقدمہ ج:۲ ص:۳۴۲)

کیا فقہاء قصوروار ہیں؟

ایک ایسے وقت اور ایسے ماحول میں جہاں لوگ جہالت کی ظلمت اور لادینیت کی دلدل میں بری طرح پھنس گئے ہوں، فقہاء پر عیب لگانا کوئی غیر متوقع اور زیادہ تعجب انگیز بات نہیں، کیونکہ صفراء کا مریض شہد کو بھی کڑوا کہتا ہے، حالانکہ قصور شہد کا نہیں ہوتا بلکہ مریض کا مزاج بگاڑ کا شکار ہونے کی وجہ سے اسے پسند نہیں کرتا ہے، پھر ہر آدمی اپنے ماحول اور عقل کے تناظر میں اشیاء کا جائزہ لیتا ہے، اس بارے میں ایک مثل مشہور ہے کہ ایک علاقے میں کوئی آیا، اتفاق سے اس علاقے کے لوگوں

کی ناکیں چپٹی ہوئی تھیں، اس شخص کو دیکھ کر لوگوں نے تالیاں بجانا اور شور مچانا شروع کیا کہ ناکو آگیا۔ بعینہ اسی طرح آج فہمِ دین کا درجہ اتنا ادنیٰ ہو چکا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ بآسانی کیا جاسکتا ہے، گوکہ اس میں سب لوگ برابر نہیں مگر اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے اور یہ شرح مسلسل بڑھ رہی ہے، اگرچہ دینی تعلیمات عام ہو رہی ہیں، اخبارات اور جرائد میں فتوے شائع ہو رہے ہیں، منبروں پر تقریریں ہورہی ہیں، مسائل بیان کئے جارہے ہیں اور مسجدوں میں دروس کے انتظامات بڑے پیانے پر کئے جارہے ہیں، مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ علم فقط مسائل جاننے کا نام نہیں بلکہ اس میں ملکہ پیدا کرنا ہی اصل علم ہے، اور وہ چیز آج معدوم و ناپید ہے۔

مثلاً: آپ کو مسجد میں ایسے لوگ بھی بآسانی نظر آجائیں گے جو نمازی ہونے کے باوجود اتنا بھی نہیں جانتے ہیں کہ صف کی ابتداء کہاں سے ہونی چاہئے؟ وہ یا تو بالکل الگ ایک سائڈ میں کھڑے ہوکر الگ صف بناتے ہیں یا ان میں سے ایک کسی صف کے کنارے کھڑا ہوکر باقی لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، وہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ بجائے اس کے کہ ساتھ والے شخص کو اپنی طرف قریب کراؤں پھر وہ دوسرے کو قریب کرلے یا اور اس طرح پچاس آدمی کو میری طرف آنا پڑے یا پھر صف میں خلا رہ جائے کیوں نہ میں صف کے آخری آدمی کے ساتھ خود قریب ہو جاؤں۔

ایسے لوگوں کے ذہن میں فقہ اور فقیہ کی کیا قدر منزلت ہوگی؟ اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہیں، فقہاء کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے شارع کے ارشادات کو سمجھا ہے اور لوگوں کے لئے انہیں آسان فرمایا ہے، جیسے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وکذالک قال الفقهاء وهم اعلم بمعاني الحديث." (ترمذی باب غسل المیت) کہ فقہاء حدیث کا مطلب زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔

اسی نکتے کو بعض ظاہربین لوگوں نے جھگڑے کی بنیاد بنایا ہے، حالانکہ ان کو

تو فقہاء کا احسان مند ہونے کا اقرار کرنا چاہئے تھا اور ان کا شکرگزار ہونا چاہئے تھا کیونکہ فقہاء ہی وہ جماعت ہے جس نے اپنی انتھک محنتوں سے امت کے لئے ایسے اصول وضع کردیئے اور ایسے ضابطے بنادیئے کہ جس کے اندر تمام جزئیات کو اور قیامت تک آنے والے واقعات اور رونما ہونے والے حادثات کو بند کردیا ہے، ان کی محنتوں کی بدولت اسلام اب کسی زمانے تک محدود نہ رہا بلکہ ان قوانین کی روشنی میں ہر دور کے مسائل اس سے معلوم کئے جاسکتے ہیں۔

پھر یہ قوانین چونکہ شارع ہی کے کلام سے اخذ کئے گئے ہیں اس لئے جو بھی مسئلہ فقہ کی طرف منسوب ہوگا تو وہ دراصل شارع کی طرف ہی منسوب ہوگا۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ ایک آدمی نے اپنے خادم سے کہا: میں سوجاتا ہوں، تم بچوں کو شور نہ کرنے دو۔ اب اگر خادم ہوشیار ہوگا تو آرام پر خلل انداز ہونے والی ہر چیز کو وہاں سے ہٹائے گا، خواہ وہ بچوں کے کھیلنے کا شور ہو یا رونے کا غل، رکشہ وغیرہ گاڑی کے ہارن کا شور ہو یا عمر رسیدہ آدمیوں کے زور سے بولنے کا وغیرہ، اگر وہ صرف بچوں کو ہی روکتا ہے اور مستری کو ہتھوڑا مارنے یا کسی کو ڈھول بجانے سے نہیں روکتا کیونکہ اس کے زعم میں صاحب نے تو صرف بچوں کا نام لیا ہے، ڈھول کی آواز کا نام تو نہیں لیا ہے، تو کیا یہ صورت زیادہ سنجیدگی اور تعمیل کی ہے یا پہلی صورت؟ نیز اگر پہلی صورت میں وہ کسی بڑے معمر شخص کو شور کرنے سے روکتا ہے تو کیا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ خادم اپنی طرف سے روکتا ہے یا یہ کہ اپنے صاحب کے کہنے پر؟ ظاہر ہے ہر باشعور آدمی یہی کہے گا کہ یہ سب کچھ وہ اپنے صاحب کے کہنے پر کر رہا ہے، اگرچہ اس نے ان تمام چیزوں کے نام گن کر نہیں بتلائے تھے۔

ٹھیک اسی طرح فقہاء نے شارع کے کلام کا مقصد جان کر اس سے قوانین اور کلیات اخذ کیں جو عیب کی بات نہیں بلکہ حکمت اور دانشمند کا اثر ہے۔

آسان لفظوں میں اس کی مثال ابوداؤد کی اس حدیث کے ضمن میں سمجھ لیں:

"عن ابن عمر قال: سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: اذا تبایعتم بالعینة واخذتم اذناب البقر ورضیتم بالزرع وترکتم الجهاد سلط الله علیکم ذلًا لا ینزعه حتیٰ ترجعوا الی دینکم."

(ص:۴۹، مطبوعہ میر محمد)

ترجمہ:...... "حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم بیع عینہ کرنے لگو اور گائے (بیل) کی دم پکڑنے لگو اور زراعت پر خوش ہوکر جہاد کو چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ایسی ذلت مسلط کردے گا جو اس وقت تک نہیں اتارے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہ لوٹو گے۔"

اس حدیث میں مسلمانوں کی ذلت کے دو اسباب بتلائے گئے ہیں، ایک عینہ کی بیع اور دوسرا زراعت۔ بیع عینہ یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز ادھار دے دی جائے اور پھر اس سے کم قیمت میں (نقد کے ساتھ) واپس لے لے۔

دوسری احادیث کی طرح اس حدیث میں بھی دو پہلو ہیں، ایک ظاہری کہ ان دو ہی چیزوں سے بچا جائے تو ذلت نہیں آئے گی۔

دوسرا اصل مطلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ جہاد اور دین کے سوا دنیاوی کاموں میں انہماک سے دشمن کو موقع ملتا ہے، وہ ہتھیار بنانے میں لگ جائے گا اور تم معیشت کے استحکام میں، اس طرح ایک وقت ایسا آجائے گا کہ تم جہاد کے لئے ضروری قوت اور اقدامات سے محروم ہوجاؤ گے، جبکہ تمہارا دشمن مضبوط سے مضبوط تر ہوجائے گا، پھر تم اس کا مقابلہ نہیں کرسکو گے تو وہ تمہیں شکست دے کر ذلیل کردے گا۔

یہ دوسرا مطلب فقاہت پر مبنی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان سے ان کی مراد وغرض کے مطابق ایک قانون کلی مستفاد کیا گیا جس میں زراعت کے علاوہ کھیل تماشے مثلاً: ٹی وی، کرکٹ، حرفت اور صنعت وغیرہ تمام دنیوی شعبے شامل ہیں، یہ صرف زراعت کی نحوست کی بناء پر نہیں بلکہ حرام خوری اور آرام طلبی کی وہ تمام صورتیں اس میں داخل ہوئیں جن کی بناء پر دین اور جہاد سے دوری لازم آتی ہو۔

بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو دوسرا مطلب بالکل صحیح اور قابل فہم ہے کہ آج کل مسلمانوں پر ذلت کا عذاب صرف اسی وجہ سے نہیں آیا کہ وہ زراعت یا بیع عینہ میں لگ گئے تھے، بلکہ دیکھا جائے تو ان دونوں سے زیادہ دیگر تباہی کے اسباب باعثِ ذلت ہیں، آج یہود و ہنود اور تمام مغربی ممالک اسلحہ سازی میں لگے ہوئے ہیں، جنگیں لڑنا ان کی خارجہ پالیسیوں کا لازمی حصہ بن چکی ہیں، جبکہ مسلمان معیشت اور زیادہ سے زیادہ قرضے وصول کرنے، عیش وآرام کا سامان کرنے اور لباس وغیرہ کی فکر میں منہمک ہیں، آج جبکہ یہ سطور زیر قلم ہیں ساری دنیا میں جنگ کی باتیں ہو رہی ہیں، ہم نے اپنے پڑوس میں ایک اسلامی ریاست کو ختم کرنے میں کوئی کسر روا نہ رکھی، اب عراق پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں مگر ساری قوم کی نظر ٹی وی کی اسکرین پر ہے کہ جنوبی افریقہ کے کھیل کے میدان میں کرکٹ کا کھیل کون جیتتا ہے؟

تو کیا یہ سب کچھ تو جائز ہو جائے اور صرف زراعت والوں کو ملزم قرار دے کر ساری ذمہ داری ان کے سر پر ڈال دی جائے؟

فقہاء نے اپنی زندگیاں اسی مقصد میں صرف کیں کہ نصوص کے علل کو معلوم کیا جائے، باہم تعارض کو رفع کیا جائے، تطبیق کرکے یا ترجیح دے کر پھر ناسخ ومنسوخ اور حقیقت ومجاز اور عام وخاص وغیرہ میں فرق کرکے ان کے محامل اور موقع تلاش کیے جائیں۔

اگر لاکھوں میں ایک دو مسئلے ایسے آجاتے ہیں جہاں مقلد یا غیر مقلد کی نظر

میں کسی امامِ مذہب یا کسی فقیہ سے غلطی سرزد ہوئی ہے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بہانا بنا کر تیرِ تنقید نہیں بنانا چاہئے، بلکہ اس کی توجیہ کرلینی چاہئے اور حسن ظن کے مطابق یوں کہنا چاہئے کہ شاید اس میں دوسرے مذہب کے امام کی بات زیادہ وزنی ہو، گویا یہ اجتہادی غلطی ہے کوئی معصیت نہیں، اللہ اجتہادی خطاء پر بھی ایک نیکی عطاء فرماتا ہے۔

اس بارے میں عبدالرحمٰن بن خلدون نے کیا خوب بات کہی ہے!:

''آپ ائمہ مجتہدین کے بارے میں بدگمانی نہ کیجئے، لوگوں میں یہی وہ طبقہ ہے جو حسن ظن کا زیادہ حقدار ہے، اگر ان کی کوئی بات بظاہر سمجھ بھی نہ آئے تو اس کی ان کی شان کے لائق توجیہ کرلینی چاہئے۔'' (مقدمہ حصہ دوم ص:۳۴۰)

منکرینِ فقہ کی مثال:

جو لوگ فقہ سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو مسائل قرآن و حدیث کی نصوص میں مصرح نہیں، انہیں کیسے معلوم کیا جاسکتا ہے؟

اس کے جواب میں عموماً وہ یہ کہتے ہیں کہ اسلام مکمل ہے، اس میں کوئی چیز رہتی نہیں ہے، مگر جب ان سے کسی جزئی مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جائے تو تب وہ استنباط کے مجبوراً قائل ہوجاتے ہیں، مگر متقدمین کے فقہ کے برخلاف اپنی اختراع کے مطابق، گویا ان کا مقصد یہ ہے کہ فقہ حنفی، مالکی یا شافعی کی ضرورت نہیں ہم نئی تدوین کریں گے۔

ایسے لوگوں کی مثال یوں سمجھ لینی چاہئے کہ ایک شخص سائنسی تجربات اور ضرورت کا تو قائل ہو، مگر وہ یہ اصرار کرتا ہو کہ اب تک کی تحقیق سے جو اشیاء معرض وجود میں آئی ہیں ان سب کو تلف کرکے نئے تجربات کئے جانے چاہئیں، تاکہ موجودہ چیزوں سے بہتر نمونے تیار کئے جائیں۔ ظاہر ہے ایسا کہنے والا کوئی احمق ہی ہوسکتا

ہے، پھر اگر وہ یہ بات کہہ دے تو کوئی دانشمند اس کی بات پر کان نہیں دھرے گا، کیونکہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان اشیاء کو تلف کرنے کے بعد پھر سے ایسی تحقیق میں کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے؟ بلکہ اگر اسے شوق ہے تو سابقہ کاوشوں پر پانی پھیرنے کی بجائے وہ اپنی جستجو میں لگا رہے شاید وہ کوئی نعم البدل لانے میں کامیاب ہوسکے، سابقہ تحقیق کو تلف کرنے اور اس پر مرتب ثمرات کو ضائع کرنے اور اس کے ماہرین کو تنقید کا نشانہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ٹھیک اسی طرح غیر مقلدین کو چاہئے کہ نت نئی ایجادات کے اس دور میں مسائل فقہیہ کی بہت ضرورت پیش آتی ہے، اور وہ اشیاء نہ تو نصوص میں صراحت سے بیان کی گئی ہیں اور نہ ہی آپ کے موقف کے مطابق ان کا حکم معلوم کیا جاسکتا ہے، لہٰذا اگر آپ کے پاس ان مسائل کا حل نہیں تو ان لوگوں پر تو لعن طعن نہ کریں جو اس کی اہلیت رکھتے ہیں۔

آپ تو آج تک یہ ثابت نہ کر سکے کہ بھینس اور اس کے دودھ کا حکم کہاں سے اور کیسے ثابت ہے؟ حالانکہ یہ ایک پرانا مسئلہ ہے، اگر اسے گائے پر قیاس کرتے ہیں تو اس سے فقہاء کی بات ماننی پڑتی ہے، اور اگر الگ جنس مانا جائے تو قرآن و حدیث میں اس کا نام تک کہیں نہیں ملتا، ایسے میں آپ جدید، جدید تر اور جدید ترین مسائل کا حل کہاں سے نکالیں گے؟

قیاس کلیات اور جزئیات کو ملانے کا واسطہ ہے، اضافہ نہیں:

بعض ظاہر بین قسم کے لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قیاس اس اعتبار سے شرع کے منافی ہے کہ یہ احداث فی الدین یعنی دین میں اضافہ اور زیادتی کا راستہ ہے، حالانکہ یہ غلط فہمی ہے، حقیقت ایسی نہیں جیسا کہ آپ نے سابقہ مثال سے اندازہ لگالیا ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ حضور علیہ السلام ایک مقنن تھے، پھر دینِ اسلام کسی مخصوص خطے یا محدود زمانے کا مذہب نہیں، دوسری طرف یہ طے شدہ ہے کہ گن گن کر جزئیات کا احاطہ ممکن نہیں، اس لئے شریعت کے عام احکام قوانین کلیہ ہیں، مثلاً: صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کے اولین مخاطب تھے، ہمارا کوئی نام نہ تھا، مگر آج ہم بھی قرآن پاک کے مخاطب ہیں، ظہار کے کفارے کا حکم خاص صحابی کے متعلق نازل ہوا، مگر ہر ظہار کرنے والا اس کفارہ پر عمل کرسکتا ہے، علیٰ ھذا القیاس!

چونکہ جزئیات وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے رونما ہوتی رہتی ہیں، محض وضع کے اعتبار کسی منقول کلی میں سما نہیں سکتیں، اس لئے قیاس کو درمیان میں لاکر ان کو قوانین کلیہ سے ملایا جاتا ہے تاکہ ان کا حکم بھی معلوم ہوسکے، چنانچہ ابن خلدون رقمطراز ہیں:

”خوب یاد رکھئے! انسان جن علوم میں غور وخوض کرتا ہے، اور جن کو لوگ شہروں میں سیکھتے اور پڑھتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں: طبعی جن پر انسان اپنی فکر سے قابو پالیتا ہے ...... دوسری قسم علوم نقلیہ وضعیہ کی ہے، ان تمام علوم کا مرجع ومستند واضع شرعی کی خبریں ہیں، ان میں عقلی گھوڑے دوڑانے کا میدان نہیں۔ ہاں! عقل کے ذریعہ اور قیاس کے راستے سے جزئیات کو کلیات سے ضرور ملایا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ ان میں فروع اصول سے بذریعۂ قیاس ملائے جاتے ہیں، کیونکہ جزئیات جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی رہتی ہیں محض وضع کے اعتبار سے کسی منقول شرعی کے اندر سما نہیں سکتیں اس لئے انہیں قیاس کے ذریعے کلیات سے ملانا پڑتا ہے، مگر یہ قیاس بھی خبر ہی سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ اصل میں حکم کا ثبوت ہے اور اصل منقول ہے، اس لئے قیاس کا مرجع بھی نقل ہی ہوئی۔“ (مقدمہ حصہ دوم ص:۳۲۹)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ قیاس اور بدعت میں بڑا فرق ہے، قیاس سے نیا حکم ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی جزئی کو کلی سے ملاکر اس کلی کے حکم میں شامل کیا جاتا ہے اور چونکہ اصل اور کلی تو منقول ہے لہذا یہاں کوئی نیا حکم نہیں لگایا گیا بلکہ یہ ظاہر کیا

گیا کہ یہ جزئی اس کلی کے حکم میں ہے، بالفاظ دیگر قیاس سے ثابت (مقیس) کسی قاعدہ کلیہ کے اندر ہوتا ہے، جبکہ بدعت کا حکم نیا اور بالکل خودساختہ ہوتا ہے، وہ کسی قانون سے اخذ شدہ نہیں ہوتا ہے۔

اس غلط فہمی کی مثال ایسی ہے کہ آج کل لوگ علماء پر یہ اعتراض بکثرت کرتے ہیں کہ: ''مولوی تو لوگوں کو کافر بناتے ہیں۔'' یہ بات اس وقت کہی جاتی ہے جب کوئی آدمی عملِ کفر کی وجہ سے فتویٰ کی زد میں آجائے، اور ازالہ کی مثال ایسی ہے کہ ان سے کہا جائے کہ علماء کافر بناتے نہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں، یعنی وہ مولوی کے فتوے سے کافر نہیں ہوا بلکہ ظاہر ہوا، کیونکہ اس نے ایسی بات کہی تھی یا ایسا کام کیا تھا جو کسی قاعدے کے مطابق کفر کے زمرے میں آتا تھا، لوگوں کو اس کا پتہ نہیں تھا تو مفتی صاحب نے وہ کلیہ اس پر منطبق کرکے اِس کو اُس میں شامل کردیا جس سے عام لوگوں پر اس کا کفر ظاہر ہوا۔

ٹھیک اسی طرح یہ سب جزئیات روزِ اول سے ان قوانین میں داخل تھیں، مگر عدمِ موجودگی کی وجہ سے لوگوں کو ان کا حکم معلوم نہ تھا، فقہاء کرام نے ہمیں ان کا حکم معلوم کرنے کا طریقہ بتلایا اور خود بھی اس کی کچھ تفاصیل بتلادیں، ''فقہ'' اس کے سوا کچھ نہیں۔ گویا فقہاء احکام بناتے نہیں بلکہ احکام بتاتے ہیں، اگر اس ایک نکتہ اور نقطہ کو صحیح سمجھا جائے تو جھگڑا ختم ہوجائے گا۔

فقہاء میں اختلاف کے اسباب:

اس ضمن میں یہ وضاحت کرنی بھی ضروری ہے کہ جس طرح غیرمقلدین کو فقہاء کے قیاس پر اعتراض ہے، اسی طرح اکثر متجددین کو فقہاء کے اختلاف پر بھی اعتراض ہے، چونکہ ان دونوں اعتراضوں سے فقہ کی منزلت پر نہ صرف اثر پڑتا ہے بلکہ اس کی وقعت لوگوں کے ذہنوں سے جاتی رہتی ہے، پھر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ

متکاسل اور کاہل قسم کے لوگ تو عمل سے پہلو تہی کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ: علماء جب خود کسی مسئلے پر متفق نہیں ہوتے ہیں تو ہم کہاں جائیں؟ ہم کس پر عمل کریں؟ کس امام کے پیچھے اور کسی مسجد میں نماز پڑھیں؟ وغیرہ وغیرہ، جبکہ عصری علوم کے زہر سے لیس یا یوں کہیئے کہ مستغربین کو رائے زنی کا موقع ملتا ہے کہ جب علماء عقل سے مسائل دریافت کرسکتے ہیں تو کیا ہم ان سے کم ہیں؟

اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ اس ضمن میں پہلی غلط فہمی کے ازالے کی طرح دوسری کا بھی ازالہ کیا جائے، بلکہ پہلے اعتراض سے یہ دوسرا زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ پہلا اشکال بھی اگرچہ صحیح نہیں مگر اس میں دقتِ نظر کی ضرورت ہے کہ قیاس کیا چیز ہے؟ اس لئے بعض علماء پر یہ مسئلہ مخفی رہا جبکہ دوسرا اعتراض محض تلبیس ابلیس ہے، جس کا مقصد کوئی حق طلبی نہیں بلکہ حق میں ابہام پیدا کرنا ہے، گویا پہلا اشکال کم علمی اور دوسرا لاعلمی پر مبنی ہے۔

جو لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں ان سے گزارش کی جاتی ہے کہ علماء کا اختلافِ رائے اور دلائل عقلیہ سے استدلال اور ہمارے استدلال میں بڑا فرق ہے، ہم اگر عقلی انداز سے بات کریں گے تو ننانوے فیصد گمراہی کا امکان ہے، جبکہ فقہاء وعلماء کی گفتگو میں غلطی کا امکان تقریباً ایک فیصد ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء جو بھی بات کریں گے وہ اصولِ شرعیہ اور نصوصِ قطعیہ کی روشنی میں ہوگی اور روشنی میں بے راہ روی کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، جبکہ مستغربین کے پاس تو ضروری فرائض کا علم بھی نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ ان اصول کے تناظر میں بات کرسکیں جن کے لئے زندگی بھر کی محنت درکار ہے، گویا علماء کی عقل نقل سے مقید ہے جبکہ مستغربین کی عقل نقل سے آزاد ہوتی ہے۔

پھر ان کا اختلاف کسی بہانے کا سہارا اس لئے نہیں بن سکتا ہے کہ لاکھوں مسائل کی تحقیق میں اختلاف ناگزیر تھا، اس میں اتحاد کا کوئی امکان نہیں تھا، لہٰذا جب

ایک چیز ممکن ہی نہیں تو اس میں تنقید کرنا فضول ہے۔

اختلاف کے ناگزیر ہونے کے کچھ اسباب تو پیچھے بیان ہو چکے ہیں، جن کا یہاں اجمالاً اعادہ کیا جاتا ہے۔

ا:...... قرآن وحدیث عربی میں ہیں اور عربی میں ایک لفظ کئی معنوں کا حامل ہوتا ہے، معنی مراد کی تعین کے لئے قرائن اور ترجیحات کا سہارا لینا پڑتا ہے اور ترجیحات مختلف ہوتی ہیں، لہٰذا اختلاف ناگزیر ہوا۔

۲:...... احادیث سب یکساں نہیں ہیں کسی کی سند قوی ہوتی ہے، تو کسی کی اقوی یا پھر ضعیف، یا ایک زمانے میں سند صحیح رہتی ہے پھر آگے چل کر اس میں ضعیف راوی آجانے کی وجہ سے ضعف پیدا ہوتا ہے، اس لئے ترجیح بدل جاتی ہے۔

۳:...... بہت سی احادیث اور احکام میں بظاہر ٹکراؤ اور تعارض معلوم ہوتا ہے، اس تعارض کو دور کرنے کے طریقے مختلف ہیں، کوئی ایک کو ترجیح دیتا ہے تو کوئی دوسرے کو، اس لئے اختلاف کے بغیر چارہ نہیں۔

۴:...... علاوہ ازیں نت نئی باتیں رونما ہوتی ہیں جو کسی نص کے گھیرے میں نہیں آتی ہیں، اس لئے اسے کسی ادنیٰ مشابہت کی وجہ سے کسی دلیل کے دائرہ میں بند کرنا پڑتا ہے۔

۵:...... مزید یہ کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مختلف ارشادات سنے اور اعمال دیکھے، پھر وہ اطرافِ عالم میں پھیل گئے، جبکہ بعض دارالہجرۃ میں مقیم رہے، انہوں نے لوگوں کو اپنے اپنے علم کے مطابق تعلیم دی اور لوگوں نے قبول کرلی، مثلاً حضور علیہ السلام نے نوجوان کو روزہ کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینے وغیرہ سے روک دیا اور بوڑھے کو اجازت فرمائی، ایک صحابی پہلی مجلس میں حاضر رہا اور نفی والی حدیث سن سکا، جبکہ دوسرا صحابی دوسری مجلس میں حاضر رہا اور اس نے رخصت والا فرمان سن لیا، فرض کرلیجئے کہ دونوں دوسری مجلس سے غائب رہے، ادھر اللہ عزوجل

نے مسلمانوں کو سوال کرنے سے روک دیا تھا، تو اگرچہ نفی کی حدیث میں یہ راز تھا کہ نوجوان بوسہ لیتے وقت اپنے اوپر قابو نہیں پاسکے گا، جبکہ بوڑھے میں یہ اندیشہ نہیں تھا، مگر اس کی صراحت نہیں کی گئی۔

اسی طرح کسی نے حضور علیہ السلام کو نماز میں رکوع کرتے وقت دونوں ہاتھوں کو کندھوں یا کانوں تک اُٹھاتے ہوئے دیکھا، جبکہ بعض دیگر نے بغیر ہاتھ اُٹھائے رکوع میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

تو جب یہ لوگ دوسروں کو یہ احادیث بیان کرنے لگے اور ہمارے دور کی طرح اس وقت تعلیم میں بہت زیادہ دلائل کا سہارا نہیں لینا پڑتا تھا (جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے) اس لئے صحابہ سے مختلف سننے والوں نے اس میں تعمیم کر کے اسے قانون کلی بنایا، اس لئے اختلاف پیدا ہوا۔

۶:...... کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اجتہاد کرتے وقت ایک مجتہد کی نظر ایک اصول پر رہتی ہے، دوسرا اصول اس وقت ذہن میں ہوتا نہیں یا ہوتا تو ہے مگر وہ مرجوح ہوتا اور جو پیش نظر ہے وہ راجح ہوتا ہے، یہ اسی کے مطابق حکم نکالتا ہے جبکہ اس کے بالکل برعکس دوسرے مجتہد کی نظر اس دوسرے اصول پر ہوتی ہے تو وہ دوسرا حکم نکالتا ہے۔

مثلاً: اللہ نے مطلقہ عورت کو عدت گزارنے کے لئے تین ''قروء'' تک انتظار کرنے کا حکم دیا ہے، جو متعین ہے کہ عورت تین قروء گزارے گی، مگر تین قروء کیا چیز ہے؟ آیا اس سے مراد تین مرتبہ ماہواری کا آنا ہے یا دو ماہواریوں کے درمیان طہارت کا زمانہ؟ چونکہ عربی لغت میں اس لفظ ''قرء'' کا اطلاق دونوں معنوں پر ہوتا ہے اس لئے ترجیح کی ضرورت پیش آئی، تو حنفیہ نے لفظ ''ثلثة'' تین عدد کے پیش کے پیش نظر حیض (ماہواری) کے معنی کو راجح قرار دے دیا، جبکہ شافعیہ نے تانیث عدد کو ملحوظ رکھ کر ''طہر'' کو ترجیح دے دی، لہٰذا حنفیہ کے نزدیک عورت عدت کے لئے تین

حیض کا انتظار کرے گی جبکہ شافعیہ کے مطابق تین طہروں کا۔

دیکھئے! یہاں اصول دونوں طرف موجود ہیں، مگر شافعیہ نے قانونِ عربی اور نحوی قاعدے کو ترجیح دے دی، جبکہ حنفیہ نے عدد یعنی خاص کے قانون کو راجح سمجھا، کیونکہ شافعیہ کا قانون عربیت اور نحو سے اخذ کیا گیا ہے جو ظنی ہے، جبکہ حنفیہ کا قاعدہ قرآن سے لیا گیا ہے جو کہ قطعی ہے، لہٰذا یہی راجح ہونا چاہئے۔

اس سے زیادہ آسان مثال یہ ہے جیسا کہ حضرت تھانوی صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اس کی تقریر فرمائی ہے:

''بعض اوقات قواعد فقہیہ کسی خاص واقعہ میں متعارض ہوجاتے ہیں، ایک عالم کی نظر ایک ضابطہ پر ہوتی ہے، دوسرے کی نظر دوسرے ضابطے پر، اس لئے اختلاف رائے پیدا ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

سورۂ عبس میں جس واقعہ کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب آیا کہ آپ نے ایک غریب نابینا مسلمان کی طرف زیادہ توجہ دینے کے بجائے رؤساء مشرکین کی طرف زیادہ توجہ کیوں فرمائی؟ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہ قاعدہ تھا کہ اصولِ دین کی تعلیم مقدم ہے فروع کی تعلیم پر، رؤسائے مشرکین سے جو خطاب ہو رہا تھا وہ اصول کی تعلیم کا تھا، یہ نابینا صحابی جو کچھ بات کرتے وہ فروعِ دین کے متعلق ہوتی، کیونکہ وہ مؤمن اور اصولِ دین کے پہلے سے پابند تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان سے مقدم کردیا، لیکن اس کے بالمقابل ایک دوسرا ضابطہ بھی تھا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت نظر نہ گئی، وہ یہ کہ وہ کام مقدم رکھنا چاہئے جس کا نفع متوقع اور اس کے کامیاب ہونے کی امید زیادہ ہو، بمقابلہ اس کام کے جس کا نفع موہوم اور کامیابی کی توقع کم ہو، یہاں معاملہ ایسا ہی تھا کہ رؤسائے مشرکین کے لئے تعلیم اصول کا اثر موہوم تھا اور مسلمان کے لئے تعلیم فروع کا نفع یقینی، اس لئے قرآن کریم

نے اس کو ترجیح دینے کی ہدایت فرمائی اور عتاب اس پر ہوا کہ آپ نے اس ضابطہ پر توجہ کیوں نہ فرمائی۔ (مجالس حکیم الامتؒ ص:۱۶۴)

تقلید کی تعریف اور حکم:

تقلید کے حوالے سے بعض لوگوں کے ذہن میں ایک بڑی غلط فہمی اور اشکال یہ ہے کہ سوائے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے کی تقلید کیسے جائز ہو سکتی ہے، حالانکہ ہمیں تو رسول کی اطاعت کا حکم ہے، کسی اور کے اتباع کے تو ہم مکلّف نہیں ہیں؟ پھر یہ بھاری بار اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ اس کی وجہ سے اصل متابعت پر منفی اثر پڑتا ہے، لہٰذا یہ ناجائز ہے۔

یہ غلط فہمی بھی لاعلمی اور تقلید کے مفہوم سے بے خبری کا نتیجہ ہے، اگر تقلید کا مطلب ومعنی سمجھ میں آجائے تو کوئی اپنے آپ کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقلد نہیں کہے گا بلکہ مؤمن ہی کہے گا، اس تفصیل میں جانے سے پہلے تقلید کی تعریف اور حقیقت جاننا لازمی ہے۔

جو بات، جملہ اور کلام ہم سنتے ہیں تو اس کے بارے میں دل میں علم کی متعدد کیفیات پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے، کبھی کہنے والا جھوٹا ہوتا ہے، تو ہمیں اس کی بات پر باور نہیں ہوتا ہے، کبھی وہ سچا ہوتا ہے مگر کچھ قرائن اس کی بات کے خلاف ہوتے ہیں، پھر بھی ہمیں یقین نہیں آتا، کبھی وہ بات ایسی ہوتی ہے کہ آدمی سچ اور جھوٹ کا فیصلہ نہیں کرسکتا ہے، لہٰذا ضروری نہیں کہ ہر بات پر یقین ہی مرتب ہوتا ہو، مثلاً: کسی نے زید کے کھڑے ہونے کی خبر سنائی تو اگر سننے والا نہ اس کو جھٹلا سکتا ہو اور نہ ہی تصدیق کرسکتا ہو، وہ دونوں پہلوؤں کو مدنظر رکھتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کھڑا ہو اور ہوسکتا ہے کہ کھڑا نہ ہو، اور یہ دونوں پہلو اس کے ذہن میں برابر ہوں تو اسے شک اور تردد کہتے ہیں، لیکن اطلاع اور خبر کے مطابق اگر سننے والے کو زید کے کھڑے ہونے کا

باور ہوتا ہے تو اس کو اعتقاد کہتے ہیں، پھر اس کی پانچ قسمیں اور صورتیں ہیں۔ وجہ حصر یہ ہے کہ اس اعتقاد میں جانب مقابل یعنی ضد اور نقیض (جو مثال مذکور میں زید کے کھڑے نہ ہونے کا پہلو ہے) کا احتمال رہے گا یا نہیں؟ اگر احتمال رہتا ہے تو اسے ''ظن'' یعنی گمان کہتے ہیں، اگر نہیں رہتا تو اسے ''جزم'' کہتے ہیں، ظن کے مقابلے میں جو کیفیت ہوتی ہے اس کو ''وہم'' کہتے ہیں، یعنی موہوم احتمال۔

پھر جزم یا اس درجے کا ہوگا جو شک ڈالنے اور اشکالات پیش کرنے والے کی وجہ سے زائل اور ختم ہوتا ہوگا یا نہیں، اگر زائل ہوتا ہو تو اسے ''تقلید'' کہتے ہیں پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔

جس کی تقلید کی جاتی ہے وہ اپنی بات میں مصیب ہوگا یعنی غلطی نہ کر چکا ہوگا یا مخطی ہوگا یعنی اس سے اس بات میں خطاء اور غلطی آئی ہوگی۔ اول کو تقلیدِ مصیب کہتے ہیں، جبکہ دوسرے کو مخطی کی تقلید کہا جاتا ہے۔ تقلید کے مقابل ہے تخییل ہے، یعنی کبھی کبھی خطاء کا خیال آنا، یعنی یہ تصور کرنا کہ میں نے جس آدمی (مقلَّد) کی بات پر باور کیا ہے ممکن ہے اس سے اس مسئلہ میں غلطی سرزد ہوئی ہو، اور اگر کسی کی تشکیک یا شبہات ڈالنے سے وہ (جزم) زائل نہ ہوتا ہو تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں، یا وہ بات واقع اور نفس الامر میں ایسی ہی ہوگی جس طرح اس کی اطلاع دی گئی ہے، یا اس کے برخلاف ہوگی، اگر واقع کے مطابق ہوگی تو اسے یقینی کہتے ہیں اور اگر موافق نہ ہو تو اسے جہل مرکب کہتے ہیں۔

ان دونوں کے مقابلے میں انکار آتا ہے، لہٰذا دونوں جانبوں کو ملا کر کل اقسام نو (۹) بن گئیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے واضح ہوتا ہے:
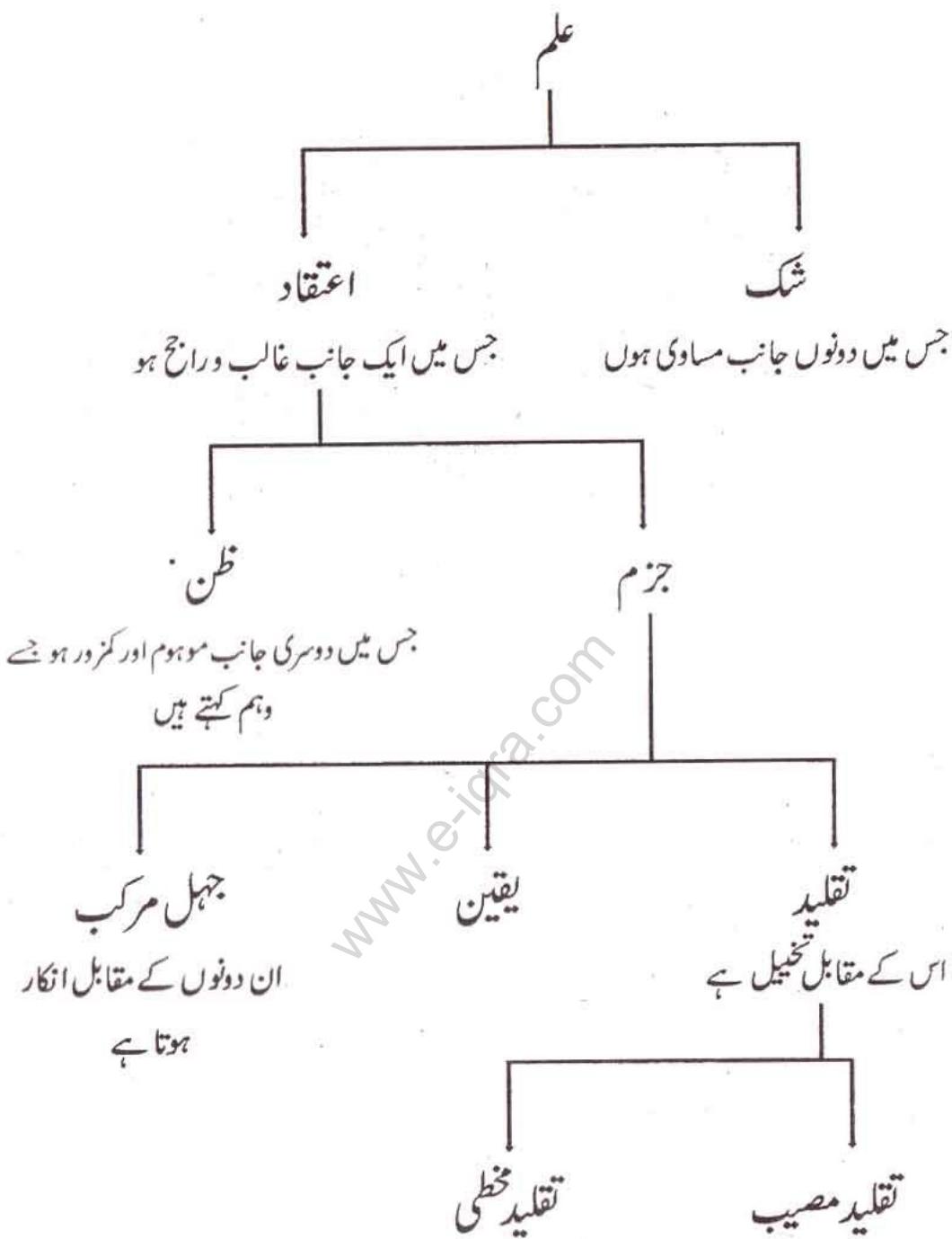
تقلید کا درجہ ظن سے اعلیٰ اور یقین سے ادنیٰ درمیانہ ہے، جس کو ظن غالب اور غالب گمان کہتے ہیں، اسی اندازے سے تفاوت ظن اور تقلید کے مقابل اوصاف میں بھی رہتا ہے بایں معنی کہ ظن تقلید سے کمزور مگر وہم تخییل سے قوی ہے، گویا ترازو کے دونوں پلڑوں کی طرح، اس کی پوری حقیقت اگرچہ عوام کے ذہن میں نہیں آسکتی

اور نہ ہی اس کی تفصیل کا یہ موقع ہے، تاہم اتنی بات ضرور سمجھ آئی ہوگی کہ یقین اور تقلید میں بڑا فرق ہے، یقین علم اور تصدیق کا آخری درجہ ہے، جس کے حصول کے بعد آدمی دوسرے پہلو سے انکار ہی کرتا ہے، جبکہ تقلید کا درجہ اس سے کم ہے، علم تقلیدی کے حصول کے باوجود اس میں زوال کا احتمال رہتا ہے۔

ایمانِ تقلیدی قابل قبول ہے یا نہیں؟ یہ الگ موضوع ہے، البتہ یہ بات پکی ہے کہ نبی کی بات پر ہر مؤمن یقین رکھتا ہے، اور اس میں غلطی کا احتمال سختی سے ردّ کرتا ہے، جبکہ تقلید میں یہ عنصر نہیں ہوتا ہے کیونکہ کوئی مقلد یہ نہیں کہتا کہ ہمارے امام نے جو کچھ کہا ہے وہی صحیح ہے اور اس کے برعکس جس امام نے جو کچھ کہا ہے وہ غلط ہے، کیونکہ مذاہبِ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ تقلید کا مفہوم وہی ہے جو اوپر بیان ہوا، یعنی غالب گمان یہ ہو کہ ہمارے امام کی بات صحیح ہوگی، مع ہذا اس میں خطاء کا خیال بھی آتا ہے۔

اس مفہوم کو سامنے رکھ کر کون مؤمن ایسا ہوسکتا ہے جو خود کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقلد کہے؟ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی باتوں میں تو خطاء اور غلطی کا کوئی احتمال ہی نہیں ہوتا، وہ تو سراسر صحیح ہی صحیح اور ٹھیک ہی ٹھیک باتیں کہتے ہیں، جبکہ ائمہ کی باتوں میں حسن ظن کا پہلو غالب تو رہتا ہے مگر بات کے مقابل پہلو و جانب کو اس میں یکسر ردّ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

''فروق اللغات فی التمیز بین مُفاد الکتاب'' میں نورالدین الحسینی الموسوی الجزائری نے طبری کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''ان التصدیق لا یکون الا فیما یبرھن عند صاحبہ والتقلید یکون فیما لم یبرھن، ولھٰذا لا یکون التقلید للنبی صلی اللہ علیہ وسلم وتسلیماً وان کان التصدیق لہٗ.''

یعنی نبی کی تصدیق کی جاتی ہے تقلید نہیں کی جاتی، کیونکہ تصدیق اس بات میں ہوتی ہے جس کی قطعی دلیل موجود ہو جبکہ تقلید اس بات میں کی جاتی ہے جس کی قطعی دلیل نہ ہو۔

یعنی دلیل کا مطالبہ تو دونوں سے نہیں ہوتا ہے، نبی سے اس لئے کہ اس سے دلیل کا مطالبہ کرنا کفر ہے، بالفاظ دیگر ایمان لانے کے بعد جو آدمی کسی نبی کی بات پر یہ کہے کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ تو وہ کافر ہوجائے گا، ہاں! اس کی حکمت پوچھی جاسکتی ہے جیسے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ پوچھنا ثابت ہے: "وِلِمَ یا رسول اللہ؟" (کیوں اے اللہ کے رسول؟) یہ حکمت تلاش کرنے کے لئے سوال ہوتا تھا دلیل کا نہیں، نبی کی بات تو بسر وچشم قبول کرلینی لازم ہے۔

جبکہ امام سے دلیل کا سوال موجبِ کفر تو نہیں ہاں! اس سے سوال نہیں ہوگا کیونکہ مقلد جاہل ہوتا ہے اور جاہل کو ہر ہر بات پر دلیل کے تناظر میں سمجھانا ممکن نہیں، چنانچہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اذ لیس للمقلد ان ینازع المجتهد فی حکمه." (تفسیر بیضاوی ج:۲ ص:۲۰۶)

یعنی (جہالت کی وجہ سے) مقلد کو یہ حق اور مقام حاصل نہیں کہ وہ مجتہد سے بحث و مباحثہ کرے، کیونکہ اگر وہ بحث کی اہلیت رکھتا تو پھر تقلید کیوں کرتا؟ اپنا اجتہاد کیوں نہیں کرتا ہے؟

اس پر محشی نے مزید لکھا ہے کہ:

"وذالک ان المقلد لیس من اهل العلم ولا یملک الدلیل لمنازعة المجتهد قال عمر وغیره من العلماء: اجمع الناس علیٰ ان المقلد لیس معدوداً من اهل العلم وانّ العلم معرفة الحق بدلیله."

مقلد اہل علم میں سے نہیں ہوتا ہے، اس کے پاس دلیل نہیں ہوتی ہے جس کی بناء پر مجتہد سے بحث کرے (اور سوالات کرے)، عمر وغیرہ علماء نے فرمایا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ مقلد اہل علم میں شمار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ علم دلیل کی روشنی میں حقیقت جاننے کا نام ہے (اور مقلد اس سے محروم ہے)۔

چونکہ قیاس دلیل ظنی ہے، اس لئے مقلد جس بات میں کسی کی تقلید کرتا ہے وہ کسی قطعی دلیل سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے غیر مبرہن اور غیر یقینی یعنی ظنی کہلایا جائے گا، جبکہ مؤمن جس نبی کی بات سنتا ہے، تو نبی کا کہنا ہی برہان اور قطعی دلیل ہوتا ہے، اس لئے وہ حکم مبرہن اور یقینی کہلایا جائے گا، کیونکہ نبی کی بات بلاشک وشبہ صحیح ہے، جبکہ مقلَّد کی بات میں خطاء کا امکان رہتا ہے، لہٰذا نبی کی بات مفیدِ یقین ہوگی اور مجتہد کی بات مفیدِ ظن وگمان ہوگی۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ آج کل جہالت کا دور دورہ ہے اور علمِ دین کا اصلی فہم ناپید ہو چکا ہے، اس لئے نفس امکان اگر چہ ہے تو مگر اجتہاد کا امکان وقوعی نہیں ہے، لہٰذا دورِ حاضر میں تقلید کے بغیر کوئی چارہ نہیں جیسے کہ ابن خلدون نے تصریح کی ہے کہ اب لوگ تقلید کے لئے مجبور ہیں، وہ فرماتے ہیں: ''اسلامی ممالک میں لوگوں نے انہیں چاروں اماموں کی تقلید پر قناعت کی اور دیگر اماموں کی تقلید کرنے والوں کا نام ونشان بھی نہ رہا، لوگوں نے اختلافِ مسالک کا دروازہ بند کردیا، کیونکہ علوم کی اصطلاحوں کی کثرت ہوگئی اور اجتہاد کے مقام تک پہنچنے کی لوگوں میں صلاحیت نہیں رہی، اور اس لئے بھی کہ ہر کس و ناکس مجتہد نہ بن بیٹھے، اس لئے صراحت سے کہہ دیا گیا کہ اب لوگ اجتہاد کی صلاحیت سے عاجز ہیں اور سب تقلید کے لئے مجبور ہیں۔'' (مقدمہ حصہ دوم ص:۳۴۴)

الحاق وتنظیر:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اجتہاد کا دروازہ بند کردیا گیا ہے تو جو اصل مقصد تھا یعنی نئے پیش آمدہ واقعات کا حکم معلوم کرنا وہ متأثر ہوا، کیونکہ نہ تو ان کے متعلق نصوص میں صراحت ہے اور نہ ہی انہیں کوئی اجتہاد کر کے معلوم کر سکے گا، پھر ان میں شرعی حکم کی معرفت کا کیا ذریعہ ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب ابن خلدون نے دیا ہے: ''جب یہ چاروں مذہب مستقل ہوکر ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گئے اور اجتہاد و قیاس کی راہیں بند کردی گئیں تو اب جزئیات میں تنظیر و الحاق کی ضرورت پیش آئی، یعنی کسی جزئی کو کسی کلی کے اندر داخل کرنے کے لئے اس جزئی کو اس کلی کے افراد کی نظیر ہونا ضروری ہے، اس کو الحاق یا قیاس کہتے ہیں، اور اگر اس میں اشتباہ ہو تو پھر وہ جزئی اس کلی کے اندر داخل نہیں کی جاتی، یہ الحاق و تنظیر انہی اصول کے مطابق عمل میں لائے جاتے ہیں جو ہر ایک امام نے اپنے طریقے کے مطابق مقرر کردیئے ہیں۔

تنظیر و الحاق کے لئے ایک جمے ہوئے ملکہ کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ اس کے ذریعے کوئی عالم تنظیر و تفرقہ پر قادر ہو اور اس سلسلے میں مقدور بھر اپنے امام کی پیروی کرے، اس زمانے میں یہی ملکہ ''علمِ فقہ'' کہلاتا ہے۔''

(مقدمہ حصہ دوم ص: ۳۴۵ مترجم نفیس اکیڈمی کراچی)

تقلیدِ شخصی:

بعض لوگ یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ تقلیدِ شخصی کا ثبوت کہاں سے ثابت ہے؟ گویا نفسِ تقلید کی تو گنجائش ہے لیکن تقلیدِ شخصی کی گنجائش تو ہرگز نہیں، یعنی یہ جائز نہیں کہ آدمی کسی فردِ معین اور امامِ مخصوص کی تقلید کرے، بلکہ جو بات پسند آئے اسی کو لے کر عمل کی بنیاد بنانا چاہیئے، بالفاظ دیگر کسی کو مخصوص مذہب تک محدود نہیں رہنا چاہیئے۔

مگر یہ سوال بدیہی البطلان ہے، یہ اہل علم سے دوری اور علم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ تمام اہل عقل ونقل کا اس پر اتفاق ہے کہ جنس کا وجود خارج میں بغیر کسی فرد کے ممکن نہیں، اگر خارج میں جنس کا کوئی وجود ہے تو وہ اس کے کسی فرد کے ضمن میں ہی ہوسکتا ہے، یہ محال ہے کہ بغیر تخصیص اور تعین کے کسی جنس کا خارجی وجود متحقق ہوسکے۔

مثلاً: سیاہی اور سفیدی کا ذہنی تصور بایں طور کہ کسی فرد کے بغیر ہم ذہن میں فرض کریں ممکن ہے، مگر جہاں خارجی وجود کی بات آئے گی تو کسی خاص فرد اور معین مادہ وشخص کے بغیر ایسا ممکن نہیں، بلکہ وہ کالے کپڑے یا سفید کپڑے، کوّے یا برف وغیرہ کے ضمن میں ہی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص رنگ مانتا ہے تو اسے فرد معین بھی ماننا پڑے گا، یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی عاقل اور صاحبِ شعور یہ کہے کہ سفیدی تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس کے لئے برف وغیرہ کی کیا ضرورت ہے؟ ٹھیک اسی طرح جو آدمی تقلید مانے اسے کہا جائے گا کہ جنس تقلید کی نوع اور قسم تو افراد (فقہاء) ہی پر موقوف ہے۔ سلم العلوم میں ہے:

"فان اللون مثلًا اذا خطرناه بالبال فلا يقنع تحصل شيء متقرر بالفعل بل يطلب في معنى اللون زيادة حتى يتقرر بالفعل." (ص:۶۷ بحث ثانی جنس)

یعنی مثلاً رنگ کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو اس سے دل کسی چیز کے فی الوقت وجود پر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ دل مسلسل جستجو میں کچھ مزید تخصیص کرتا ہے جس سے وہ رنگ اس (مخصوص محل) میں متحقق ہوجاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ تقلید بغیر تخصیص کے ممکن نہیں، ہاں! یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ تقلید کی تخصیص اور وقوع وتحقق اس طرح بھی تو ممکن ہے کہ کبھی ایک امام کی تقلید کی جائے اور کبھی دوسرے کی، جیسے رنگ کبھی ایک فرد کے ضمن میں ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کے

ضمن میں، بالفاظ دیگر چند مسائل میں ایک کی تقلید کرے اور بعض میں دوسرے کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طریقہ تقلید کے منافی ہے، کیونکہ تقلید کے معنی اعتماد اور اعتبار کے ساتھ کسی کی پیروی اور اتباع کرنا ہے، لہٰذا جب کسی امام کے اوپر اعتماد کیا تو پھر اس کے لئے یہ اصول طے کرنا کہ اس کی دو باتیں تو مانوں گا لیکن تیسری نہیں مانوں گا، سمجھ سے بالا تر ہے، اس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی کو اپنا امام و پیشوا بنانا یہ اتنا آسان فیصلہ نہیں کہ چند سیکنڈوں یا منٹوں میں کیا جاسکے، اور کچھ ہی دیر کے بعد پھر اپنی اتباع و حمایت واپس لے لے، یہ نہ پاکستانی سیاست ہے جس میں سیاستدان دن کے شروع میں ایک پارٹی میں اور ایک لیڈر کے ساتھ ہوتے ہیں، اور شام کو وفاداری تبدیل کر لیتے ہیں، اور نہ ہی کراچی کی مساجد کی امامت ہے کہ نمازی اور کمیٹی والے عصر کی نماز میں ایک امام کا تقرر اور حمایت کرتے ہیں اور رات کو دوسرے امام کی، بلکہ مذہب کا سنگِ بنیاد یوں رکھا جاتا ہے اور کسی کو امام اس طرح بنایا جاتا ہے کہ ایک مجتہد اپنے ہم عصر علماء یا کم از کم اپنے علاقائی علماء سے علم، ورع، تقویٰ، دیانت اور فہم و فراست ہر اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا ہو، علماء اس کی ذہانت اور قابلیت سے پوری طرح مطمئن ہوئے ہوں، اس کی پوری زندگی میں اہل حلقہ علماء نے اس کی کوئی بڑی لغزش نہ دیکھی ہو، انہوں نے اس کا ہر مسئلہ مختلف پہلوؤں سے جانچا ہو، مگر اس کی ہر بات قرآن وسنت کے اور ان دونوں ہی سے اخذ شدہ اصول کے عین مطابق نکلی ہو، اگر اس نے کسی مسئلے میں خلافِ منصوص قول کیا ہو تو نص پہنچنے کی صورت میں اس نے رجوع کرلیا ہو، اگر کسی مسئلہ میں کسی عالم کو شک پیش آیا ہو تو اس سے دریافت کرنے اور مراجعت کی صورت میں تسلی بخش جواب ملا ہو، مع ہذا اس کا مقصد قرآن وسنت کی روشنی میں ہی ان احکام سے لوگوں کو روشناس کرانا ہو جو اس پر ظاہر ہیں اور لوگوں پر مخفی ہوں اور جو کام وہ کرتا ہے تو اس جیسے مجتہد کے علاوہ ہر ایک عالم وہ نہ کرسکتا ہو جبکہ اس جیسے مجتہد

یا تو اس زمانہ میں ہوں ہی نہیں یا ہوں تو مگر بہت دور جہاں تک رسائی اور مسائل دریافت کرنا مشکل یا متعذر رہو، تو اس لئے وہ علماء اس موصوف کو اپنا امام بناتے ہیں، یعنی اس پر مسائل میں اعتماد کرتے ہیں، پھر ان کی وساطت سے عوام بھی اس پر بھروسہ کرتے ہیں۔

چونکہ قرآن وسنت سے استنباط کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، اور آج جیسے لوگوں کو روزانہ نئے نئے مسائل درپیش آنے کی صورت میں وہ دارالافتاء کا رخ کرلیتے ہیں اور مفتی حضرات سے مسئلہ پوچھتے ہیں، پھر کبھی مفتی بھی پریشان ہوجاتا ہے، کیونکہ اس مسئلے کی نظیر نہیں ملتی، تو وہ سوچنے لگتا ہے اور کتب کا مطالعہ کرتا ہے، اسی طرح اس امام کے پاس لوگ آتے اور نئے پیش آمدہ مسائل کا حل دریافت کرتے، جس پر وہ استنباط کر کے جواب دیتا، کسی مستفتی اور سائل نے یہ نہ کیا کہ ایک مسئلہ کوفہ میں امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا ہو اور تقلید شخصی سے بچنے کے لئے پھر سواری خرید کر دوسرے مسئلے کے لئے حجاز جاکر امام مالک سے پوچھا ہو، بلکہ لوگ ایک ہی امام کے پاس بار بار آتے، اس طرح اس کی ایک فقہ تیار ہوگئی جیسے آج کل ایک دارالافتاء کے سالہا سال کے مسائل کو جمع کیا جاتا ہے، اسی طرح اس امام کا ایک مجموعہ مسائل کا تیار ہوجاتا پھر اس کے شاگرد اس کو ترتیب دیتے تو وہ اس امام کی ''فقہ'' کہلاتی تھی، جیسے فقہ مالکی، فقہ حنفی وغیرہ۔

چونکہ وسائل کم تھے اور اسفار خطرناک تھے، پھر سفر کے لئے زیادہ وقت بھی درکار ہوتا تو جس طرح آج کل چار گھنٹے کے مختصر سفر کے باوجود لوگوں کی اکثریت حج سے قاصر ہے، اسی طرح اس دور میں بھی لوگ عموماً دور دراز علاقوں کے اسفار سے قاصر رہتے تھے، اس لئے عموماً لوگ اپنے علاقے کے بڑے عالم پر اکتفاء کرتے تھے جیسے کراچی سے کوئی مسئلہ لے کر لاہور کے عالم ومفتی سے دریافت کرنے نہیں جاتا، بعینہٖ وہ بھی اس کی ضرورت محسوس نہ کرتے اور ہونا بھی نہیں چاہئے، کیونکہ جو کام دور

جا کر ہوسکتا ہے وہ اپنے شہر میں بھی ہوسکتا تھا، اس طرح کوفی امام ابوحنیفہؒ کی وجہ سے حنفی بن گئے اور مدنی امام مالکؒ کی وجہ سے مالکی۔

پھر جب مکہ اور مصر میں امام شافعیؒ آگئے تو اس وقت کے بڑے عالم ہونے کی وجہ سے سہولت کی خاطر مکی اور مصری لوگوں نے ان کو اپنا امام بنایا، عراقیوں نے امام احمد کو، چونکہ مذکورہ بالا اوصاف کے بہت سارے مجتہد اللہ نے پیدا فرمائے تھے اس لئے ہر مجتہد کا حلقہ اس کے مذہب کا حامل ہوتا تھا، اسی طرح سیوطیؒ کے قول کے مطابق کوئی دس مذاہب تیار ہوگئے تھے، مگر وقت کے مرور کے ساتھ ساتھ اہل دنیا صرف ان چار مذاہب کی طرف لوٹ آئے اور باقی مذاہب خود بخود ختم ہوگئے۔

چونکہ سہولت بھی اسی میں ہے اور اعتماد و بھروسے کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایک ہی امام کی فقہ کا مطالعہ بھی آسان ہوتا اور اس پر عمل بھی آسان تر ہوتا اس لئے کسی نے ضروری نہیں سمجھا کہ سو مسائل ایک فقہ سے لئے ہوں اور سو سو دوسری فقہوں سے اور اپنا مذہب بنایا ہو، کیونکہ یہ چیز ایک تو خلافِ نقل ہے اور دوسرے خلافِ عقل و عرف ہے۔

خلافِ نقل اس لئے ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں کہ صغار صحابہ یا تابعین ایک دن ایک صحابی سے مسائل پوچھتے ہوں اور دوسرے دن یہ کہہ کر کسی اور کے پاس گئے ہوں کہ ہم روز آپ پر بھروسہ نہیں کرسکتے یا یہ اصول کسی نے طے نہ کیا تھا کہ پچاس مسائل ایک سے پوچھنے کے بعد باقی مسائل کے لئے کسی اور کے پاس جانا ضروری ہے، بلکہ اگر ایک عالم پر دس مسائل میں اعتماد ہوسکتا ہے تو بیس میں کیوں نہیں ہوسکتا ہے؟

اور خلافِ عقل اس لئے ہے کہ جہاں دو اماموں کے درمیان اختلاف ہو تو اپنے امام کو چھوڑ کر دوسرے امام کی بات یا تو اس لئے مانی جائے گی کہ اس نے نص پیش کی ہے اور پہلے امام کے پاس نص نہیں، تو اس سے روکنے والا کوئی بھی نہیں،

کیونکہ چاروں اماموں کی وصیت ہے کہ جب ہمارا قول نص کے خلاف ہو تو نص ہی پر عمل کیا جائے، ہاں! یہ فیصلہ ہر شخص نہیں کرسکتا ہے کہ فلاں امام کا قول نص کے خلاف ہے، کیونکہ نص کو جس طرح امام جانتا ہے یہ شخص نہیں جان سکتا ہے، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک امام، جو بعد میں آیا ہو، کے زمانہ میں کوئی حدیث ضعیف ہوئی ہو کسی نئے اور متأخر راوی کی وجہ سے تو وہ پہلے امام کے دور میں بھی ضعیف ہی ہو۔

اور اگر اس امام کی بات دوسرے کی بات سے قیاس کی بناء پر متعارض ہو تو قیاس اگرچہ قیاس کا مقابلہ کرسکتا ہے مگر ہم ایسے نہیں کہ دو قیاسوں میں یہ فیصلہ کرسکیں کہ یہ قیاس کمزور ہے اور وہ قیاس قوی ہے، ترجیح کے الگ لوگ ہوتے ہیں۔

پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی ہر بات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا؟ نیز چند مسائل کے بعد اسے چھوڑ کر دوسرے امام کی بات کو اپنی رائے سے راجح قرار دینا سابقہ اعتماد اور تقلید کے منافی ہے۔

اور خلاف عرف اس لئے ہے کہ شروع سے آج تک کسی نے ایسا نہیں کیا ہے کہ کسی ماہر طبیب وحکیم یا ڈاکٹر کے تین میں سے دو مشورے تو مان لیتا ہو اور تیسرے کو رد کرتا ہو۔

کوئی ذی عقل یہ نہیں کرتا کہ ماہر ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں سفر کرتے کرتے راستہ میں اس لئے اُترتا ہو کہ آگے کسی اور کے ساتھ جاؤں گا۔

کسی صاحبِ بصیرت سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ کسی استاذ سے صبح کے اسباق تو پڑھ کر اس پر اعتماد کرتا ہو، مگر شام کے اسباق میں یہ حسن ظن رفع ہوتا ہو اور کل صبح پھر بحال ہوتا ہو۔

کوئی ذی عقل ایسا نہیں کرے گا کہ ایک دن ایک مؤذن کی اذان پر روزہ کھولتا ہو پھر دوسرے دن دوسرے کی اذان پر اور تیسرے دن کسی تیسرے کی اذان پر۔

کسی محلے والے یہ نہیں کرتے ہیں کہ ایک دن ایک مسجد میں نماز پڑھیں اور دوسرے دن اس امام کو چھوڑ کر کسی اور مسجد میں جاتے ہوں، وغیرہ، وغیرہ۔
اور اگر آدمی یہ کہے کہ مجھے ایسا ہی اچھا لگتا ہے کہ جو مسئلہ مجھے پسند آئے میں اسی کو لیتا ہوں اور عمل کرتا ہوں۔

تو اسے کہا جائے گا کہ یہ تقلید یا اتباعِ شریعت نہیں بلکہ ہوائے نفسانی اور خواہشات کی پیروی ہے، اسی نکتے کے پیش نظر علماء نے فرمایا ہے:

"من أخذ بتفردات العلماء فقد خرج من الاسلام."

جو علماء کے شاذ اقوال پر عمل کرتا ہے تو وہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے، کیونکہ اگر اپنی مرضی سے تفردات اور من پسند اقوال کو جمع کیا جائے تو مسلم کی روایت کے مطابق جو ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، ایک روپیہ کے بدلے دو روپیہ لینا، اور صحیح بخاری کی روایت کے مطابق جو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کا قول ہے: "وطی فی الدبر" وغیرہ جائز ہوجائیں گے، وعلیٰ ھذا القیاس! ایسے بہت سے مسائل ہیں۔
(نوٹ) مذکورہ دونوں باتوں سے ان حضرات نے رجوع فرمایا ہے، یہ صرف بطورِ مثال پیش کی گئی ہیں۔
اس لئے ابن خلدون نے لکھا ہے: "یہ حرام ہے کہ چاروں کی باری باری تقلید کریں، کیونکہ اس طرح تو دین مذاق بن کر رہ جائے گا۔"
(مقدمہ ابن خلدون ص: ۳۴۴ حصہ دوم)

علاوہ ازیں یہ اعتراض اس لئے بھی فضول ہے کہ فقہ حنفیہ جو مرتب و مدون ہے اور آج بآسانی اس کا جائزہ لیا جاسکتا ہے، میں صرف امام ابوحنیفہ کے اقوال تو نہیں کہ مذکورہ اعتراض کیا جائے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ فقہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال وارشادات سے لے کر امام زفر اور امام طحاوی تک کے فرمودات و استنباطات

موجود ہیں۔

اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو فقہاء جیسی نعمت سے خوب نوازا ہے، دوسری فقہوں کی طرح فقہ حنفیہ پر بھی فقہاء نے بڑا کام کیا ہے، انہوں نے تمام مسائل کی جانچ پڑتال کر کے ان میں سب سے اعلیٰ قسم کے مسائل منتخب فرمائے ہیں، جن کو مفتیٰ بہ اقوال کہتے ہیں، ان میں ضروری نہیں کہ وہ سب امام ابوحنیفہؒ ہی سے مروی ہوں، بلکہ ان میں صاحبین کے اقوال بھی ہیں اور دیگر کے بھی، ان میں ایسے بھی ہیں جو امام ابوحنیفہ رحمہ للہ سے بلفظہٖ مروی نہ ہوں ہاں البتہ اصول امام ابوحنیفہؒ کے ہی بنیاد ہیں، کیونکہ اصول ان کے مسلّم ہیں، حتیٰ کہ ان ائمہ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے جو ان کے مقلد نہ تھے۔

چونکہ کسی مجتہد کی تقلید صرف اجتہادی یعنی قیاسی مسائل ہی میں ہوتی ہے نہ کہ نصوص میں اور قیاس امام ابوحنیفہؒ کا اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے، اس لئے حنفیہ کسی مسئلہ میں بلاوجہ ان اصول اور ان پر مرتب جزئیات کو ترک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ہیں۔

اور آج کل کے غیر مقلدین جو یہ تاثر دیتے ہیں اور عوام اور جاہل لوگوں پر تلبیس کرتے ہیں کہ حنفیہ کا مذہب نصوص کے خلاف ہے، تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ اول تو ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جو نص کے خلاف ہو اور حنفیہ کے یہاں اسی پر عمل ہو، دوسرے یہ کہ اگر کوئی مسئلہ تمہیں نص کے خلاف لگے تو ضروری نہیں کہ فی الواقع بھی وہ نص کے خلاف ہو، کیونکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ظاہر بین لوگ جن کو ''ظاہریہ'' کہتے ہیں اور وہ خود کو ''اہل حدیث''، ایک حدیث کا ایک مطلب لیتے ہیں مگر درحقیقت اصل مطلب وہ نہیں ہوتا ہے (جس کی تفصیل پہلے گزر چکی)۔

تیسرے تقلید تو فقط قیاسی اور اجتہادی مسائل میں ہوتی ہے تو جہاں نص موجود ہے وہاں تو تقلید ہے ہی نہیں، پھر اس کے خلاف نص گردانا کیسے صحیح ہوسکتا

ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ سب انسان برابر نہیں ہوتے ہیں، جیسا کہ شروع کتاب میں عرض کیا جاچکا ہے کہ کوئی انتہائی ذہین ہوتا ہے اور کوئی انتہائی کند ذہن، اور کوئی ہر بات کو قبول کرتا ہے تو کوئی کسی بات کو قبول ہی نہیں کرتا ہے، ''لا اَدریہ'' ایک فرقہ گزرا ہے جو کسی چیز کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے وجود کو بھی نہیں مانتے تھے، اس کے برعکس ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو جاہل پیروں کی ہر بات پر نص سے زیادہ عمل کرتے ہیں، اسی طرح ایسے بھی لوگ ہیں جو احادیث پر عمل اپنا مشن اور فرض سمجھتے ہیں اور ان کا یہ جذبہ بلاشبہ قابل قدر اور قابل رشک ہے، مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ صرف جذبہ ہی کافی نہیں ہوتا ہے کیونکہ بہت سے نیک جذبات لاعلمی کی وجہ سے ہلاکت کے اسباب بنتے ہیں، ویسے تو پرویزی کہتے ہیں کہ: ''ہم صرف قرآن کو مانتے ہیں'' اور ان کو اپنے اس جذبے پر فخر ہے، مگر وہ نہیں جانتے ہیں کہ حدیث کے بغیر قرآن پر عمل کیسے ممکن ہے؟ ٹھیک اسی طرح حدیث کے مطابق کبھی آدمی حامل حدیث ہوتا ہے مگر وہ اس کا مطلب نہیں جانتا ہے، تفقہ کے بغیر حدیث پر عمل نہیں ہوسکتا۔

اور یہ کوئی مفروضہ نہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو مذکورہ جذبے کے باوجود صریح غلطی کرتے ہیں اور ساری دنیا ان کو دیکھ رہی ہے، ایک دن اپنے مدرسہ کی مسجد میں ایک شخص کو میں نے دیکھا جو دروازے میں کھڑا تھا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان تقریباً ایک گز کا فاصلہ تھا، گویا وہ دیوار کو صف بنا رہا تھا، حالانکہ یہ امر نہ کسی حدیث سے ثابت ہے اور نہ اس کو طبع سلیم تسلیم کرتی ہے، اگر جماعت کی نماز میں کوئی ایسا کرے تو اس کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ وہ صف میں خلل بند کر رہا ہے، مگر انفرادی طور پر اس کا کیا مطلب؟ پھر یہ بات مسلّمات میں سے ہے کہ شریعت میں امور طبعیہ کا ذکر نہیں ہوتا ہے کیونکہ ا[illegible] میں [illegible] تعلیم کی ضرورت نہیں،

شریعت میں یہ بات نہیں کہ شب و روز میں آدمی کو کتنے گھنٹے سونا چاہئے؟ دن بھر کتنا پانی پینا چاہئے؟ اور بیوی سے کتنی بار ہمبستر ہونا ضروری ہے؟ دن میں کتنی دفعہ کھانا چاہئے؟ وغیرہ وغیرہ، اسی طرح نماز میں قیام کی حالت میں کتنے انچ کا فاصلہ ہونا چاہئے؟ یہ اس لئے مصرح طور پر نہیں بتلایا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں، جانور کے کھڑے ہونے کا بھی مخصوص انداز ہے اور آدمی کے عام حالات میں کھڑے ہونے کی بھی مخصوص اور معروف کیفیت ہے، مگر کوئی شخص اگر بس اسٹاپ پر اس طرح کھڑا ہوجائے کہ دونوں قدموں کے درمیان کم از کم ایک گز کا فاصلہ ہو تو لوگ اسے کتنا دانشمند سمجھیں گے؟ ٹھیک اسی طرح مجھے اس آدمی کی عقل پر حیرت ہوئی کہ جذبہ تو نیک ہے مگر لاعلمی اور بے وقوفی کی وجہ سے بلاوجہ خود کو تکلیف میں ڈالے ہوئے ہے، اس لئے ترمذی شریف میں حدیث ہے جس کو ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم."

ترجمہ:...... "عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ شخص پر۔"

اور ترمذی ہی کی ایک اور روایت میں ہے:

"فقیہ اَشَدُّ علی الشیطان من الف عابد."

(ابواب العلم باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة)

ترجمہ:...... "ایک فقیہ (سنجیدہ عالم) ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔"

یعنی اگر اللہ نے کسی عالم کو علم کے ساتھ فقاہت سے بھی نوازا ہے تو اس کی جگہ شیطان کو ایک ہزار عابد گمراہ کرنا آسان تر ہے، مگر وہ اس فقیہ عالم کو اپنے فریب

سے گمراہ نہیں کرسکتا ہے، اس لئے اللہ جس کی بھلائی کا ارادہ فرمائے تو اسے دین میں تفقہ عطاء فرماتا ہے۔

ان کی فقاہت کی ایک عام مثال یہ ہے کہ بخاری ومسلم میں چونکہ حالتِ نماز میں ٹوپی یا عمامہ کا ذکر نہیں تو انہوں نے استنباط کر کے بغیر ٹوپی نماز پڑھنے کا مسئلہ نکالا، آفرین!! جو لوگ قیاس کے منکر ہیں وہ خود قیاسات کرنے لگے اور قیاس بھی ایسا کہ: "بارش سے بھاگا اور پرنالے کے نیچے آگیا" کی مثال بن گیا، ان کی مثالیں لکھ کر آدمی کہاں تک اپنا اور ناظرین کا وقت ضائع کرتا رہے گا، تاہم ایک مثال ان کے پیشوا کی تحریر کرتا ہوں کہ حدیث میں آتا ہے:

"لا یبولن احدکم فی الماء الدائم."

(تم میں سے کوئی رکے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے۔)

یہ روایت بخاری وغیرہ میں ہے، امام داؤد ظاہری فرماتے ہیں کہ: پانی میں پیشاب کرنا منع ہے، کوئی اور گندگی پھینکنا منع نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی نے پیشاب پانی میں نہیں کیا بلکہ باہر کر کے کسی برتن میں وہ تالاب میں ڈال دیا تو یہ جائز ہے اور تالاب پاک ہی رہے گا، ہاں! اگر اس کے اندر پیشاب کردے تو تب ناپاک ہوگا، اسی طرح پیشاب خود چل کر پانی میں شامل ہوگیا تو پانی پاک ہے۔

دیکھئے! انہوں نے یہ سمجھا کہ یہاں لفظ "بـــول" کا آیا ہے، ہر گندگی کا تو نہیں آیا ہے، لہٰذا وہ ڈالنا منع نہیں ہوگا اور پیشاب کرنا منع ہے، ڈالنا تو ممنوع نہیں کیا گیا ہے لہٰذا پھینکنے میں کیا حرج ہے، اسی طرح ہمارے زمانے کے "ظاہریہ" نے یہ کہا کہ بغیر ٹوپی کے نماز کو منع تو نہیں کیا ہے تو لہٰذا بغیر ٹوپی کے پڑھنی چاہئے۔

اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں کیونکہ شہرۂ آفاق امام نووی شارحِ مسلم رحمہ اللہ نے اس پر جو تبصرہ کیا ہے وہی کافی ہے، چنانچہ وہ پہلے داؤد ظاہری کا مذہب نقل کرتے ہیں پھر خود اس پر تبصرہ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

"ولم يخالف في هذا احد من العلماء الا ما حكي عن داؤد بن علي الظاهري ان النهي مختص ببول الانسان بنفسه وان الغائط ليس كالبول، وكذا اذا بال في اناء ثم صبهٔ في الماء او بال بقرب الماء، وهذا الذی ذهب اليه خلاف اجماع العلماء وهو من اقبح ما نقل عنه في الجمود على الظاهر."

(نووی بر مسلم ج:۱ ص:۱۳۸، باب النهي عن البول في الماء الراكد، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ)

ترجمہ:......"اس حکم میں علماء میں سے کسی نے مخالفت نہیں کی ہے سوائے داؤد ظاہری کے کہ ان سے مروی ہے کہ یہ ممانعت انسانی پیشاب جبکہ وہ خود کرے کے ساتھ مختص ہے، اور یہ کہ پاخانہ پیشاب کی طرح (منع) نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی نے برتن میں پیشاب کرکے پانی میں بہادیا، یا اس کے قریب پیشاب کیا (اگرچہ پھر چل کر تالاب میں داخل ہوگیا) یہ منع نہیں ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ موقف جمہور کے خلاف ہے یہ ظاہر پر جمود کی بدترین مثال ہے جو ان سے مروی ہے (گویا یہ لوگ ظاہر پر اس طرح جمے ہوئے ہیں کہ ادنیٰ عاقل بھی اس پر تعجب کرتا ہے)۔"

اگر کوئی انصاف کی نظر سے دیکھے تو وہ خود فیصلہ کرے گا کہ آیا حدیث سمجھنے کے لئے فقہاء کا دامن تھامنا مناسب ہے یا ظاہریہ کا؟ جن کے فہم کا یہ عالم ہے!

حق پرستی یا مفاد پرستی:

ستم یہ ہے کہ آج کل مذہب اور دین کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کیا جاتا

ہے، غیر مقلدین کی یہ لہر عربوں کے تیل کی سیال دولت تک نہ تھی مگر جب سے مشرق وسطیٰ میں دولت کا سیلاب آیا ہے تو لوگ دولت بٹورنے کے لئے طرح طرح کے حیلے اختیار کرتے ہیں، اسی لالچ کے پیش نظر غیر مقلدین نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ پاک وہند اور افغانستان میں شرک کو ختم کرنے کے لئے ہماری خدمات حاصل کی جائیں۔

چونکہ جزیرۃ العرب میں شیطان شرک سے مایوس ہوچکا ہے وہ دیگر اسلامی ریاستوں میں اپنا کام کرتا رہتا ہے، اسی انتظام کے لئے اللہ نے آل سعود میں توحید کی بے پناہ محبت ڈالی ہے، اور حکمتِ باری کے تقاضے کے طور پر دولت عثمانیہ سمٹ کر ترکی تک محدود ہوگئی بلکہ ختم ہوگئی، بلاشبہ حرمین اور دیگر مقاماتِ مقدسہ میں سعودی حکومت نے شرک کے مقدمات کو جس طرح ممنوع قرار دیا ہے وہ قابل صد تحسین ہے، اور غیر مقلدین اس عنصر میں ان کا جو دامن تھامے ہوئے ہیں، میں اس کی خوبی کا اقرار کرتا ہوں اور قدر کرتا ہوں، مگر دین کسی ایک مسئلے کا نام نہیں ہے، اور نہ ہی اسلام میں افراط وتفریط کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، اسلام عدل اور اعتدال کا درس دیتا ہے اور خود بھی صراطِ مستقیم ہے، شرک جیسے آج منع ہے تیل کے ذخائر سے پہلے بھی منع تھا، پھر شرک کا ایک متعین مفہوم ہے، ''تقلید'' شرک ہرگز نہیں ہے، مگر یہ لوگ عربوں سے توحید کے نام پر پیسے وصول کرتے ہیں، اس لئے اس مہم کو روزافزوں فروغ مل رہا ہے، گویا نصوص اور احادیث پر عمل ایک حیلہ اور بہانہ ہے، اگر ان کا جذبہ واقعی نصوص پر عمل کرنے کا ہے تو پھر حرم شریف میں مکانات، ہوٹلوں اور منیٰ میں حاجیوں سے اتنے بھاری کرایے کیوں وصول کئے جاتے ہیں؟ کیا یہ نصوص کی مخالفت حنفی کر رہے ہیں؟ نہیں بلکہ سعودی حکومت میں یا حنبلی المذہب ہیں یا پھر غیر مقلدین ہیں، ان کے سامنے نصوص بھی ہیں اور ائمہ کے اقوال بھی، پھر یہ انہیں کیوں نظرانداز کرتے ہیں؟ کیا صرف کھل کر کھڑے ہونے سے نصوص پر عمل مکمل ہوا؟ حاجیوں سے اتنی بھاری رقوم لے کر ہڑپ کرنا حلال ہے؟

اس ضمن میں امام احمد رحمہ اللہ کا فتویٰ دیکھئے! ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الحج آیت: ۲۵ کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں کہ مکہ میں مکی اور غیر مکی دونوں کو رہائش میں مساوی حقوق حاصل ہیں، اتفاق سے اس میں انہوں نے ان علماء و ائمہ کی فہرست ذکر فرمائی ہے جو غیر مقلدین اور سعودی حکومت اور حرمین کے ائمہ و علماء سب کے لئے قابل قبول ہیں، وہ اس آیت: ”ان الذین کفروا ویصدون عن سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی جعلنٰہ للناس سواءً العٰکف فیہ والباد.“ الآیہ، (جو لوگ منکر ہوئے اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے اور مسجد حرام سے جو ہم نے بنائی سب لوگوں کے واسطے، برابر ہے اس میں رہنے والا (مکی) اور باہر سے آنے والا) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”وقال مجاھد: ”سواء العاکف فیہ والباد“
اھل وغیرھم فیہ سواء فی المنازل.“

کہ مکہ میں رہائش پذیر اور باہر سے آنے والے اس میں برابر ہیں، وکذا قال ابوصالح وعبدالرحمٰن بن سابط وعبدالرحمٰن بن زید بن اسلم۔ پھر امام شافعیؒ اور امام اسحاق بن راہویہؒ کا مناظرہ نقل کیا ہے جو منیٰ میں مسجد خیف میں ہوا اور امام احمد رحمہ اللہ بھی وہاں موجود تھے، کافی بحث ہوئی پھر امام احمدؒ نے دونوں کے درمیان فیصلہ فرمایا:

”وتوسط الامام احمد فقال تملک وتورث
ولا تؤجر جمعاً بین الادلۃ.“

امام احمدؒ نے درمیان میں فیصلہ فرمایا کہ مکہ کے مکانات بطور ملکیت اور وراثت کے تو صحیح ہیں مگر کرایہ پر نہیں دیئے جاسکتے، مناظرہ کے مختصر الفاظ یہ ہیں:

”وھذہ المسئلۃ ھی التی اختلف فیھا الشافعی
واسحاق بن راھویہ بمسجد الخیف واحمد بن حنبل

ایضاً فذهب الشافعی رحمه الله الیٰ ان رباع مکة تملک وتورث وتؤجر واحتج بحدیث الزهری ..... عن اسامة بن زید قال: قلت: یا رسول الله! أننزل غداً فی دارک بمکة؟ فقال: وهل ترک لنا عقیل من رباع؟ ...... وذهب اسحاق بن راهویه الیٰ انها لا تورث ولا تؤجر وهو مذهب طائفة من السلف ونص علیه مجاهد وعطاء واحتج اسحاق بن راهویه بما الخ ..... وتوسط الامام احمد فقال: تملک وتورث ولا تؤجر۔"

(تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۲۳۰، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ)

اگر یہ لوگ یہ توجیہ کریں کہ ہم نے وقت کے تقاضے کے مطابق ایسا کیا ہے، تو جواب یہ ہوگا کہ پھر فقہاء پر لعن طعن کیوں کرتے ہیں؟ حالانکہ فقہاء تو کبھی بھی اس حد تک نہیں گئے ہیں۔

نوٹ:......رسالہ کو زیادہ تحقیقی اور علمی اس لئے نہیں بنایا تاکہ عوام الناس بھی استفادہ کرسکیں۔

اللہ ہم سب کو انصاف پر قائم رہنے اور انصاف کی بات کہنے اور تسلیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ الی یوم الدین

والحمد للہ رب العالمین